ماہنامہ

الشروق

ای میگزین

علمی فکری تربیتی اصلاحی رسالہ

- پُرفتن دور میں علم الکلام کے اِحیا کی ضرورت
- نبیؐ کی پیروی ہی میں سراسر سرفرازی ہے
- تاریخ .... عبرت کدۂ ماضی پاسبانِ مستقبل
- اسلامک اسکولز میں فراموش کردہ پہلو
- آدابِ سیاست
- نفس کی حقیقت
- مادہ قدیم یا حادث
- علمی ورثے کا اِحیا

ماہنامہ
الشروق
ای میگزین
علمی فکری تربیتی اصلاحی رسالہ

ربیع الاوّل ۱۴۴۴ھ، جلد۱، شمارہ۱

زیرِ سرپرستی
حضرت مولانا نورالبشر صاحب دامت برکاتہم
مدیر و شیخ الحدیث معہد عثمان بن عفان کراچی

انوارِ وحی
(معارفِ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ)............... ۲

نفحاتِ مدینہ
(درسِ حدیث)............................... ۳

پُرفتن دور میں علم الکلام کے اِحیا کی ضرورت
(اداریہ)................................ ۵

نبیؐ کی پیروی ہی میں سراسر سرفرازی ہے
(مفتی محمد انیس رشید).......................... ۹

آدابِ سیاست
(جمع وترتیب: مولانا فیاض احمد)................... ۲۲

اسلامک اسکولز میں فراموش کردہ پہلو
(سید شرف الدین احمد)........................ ۲۹

تاریخ.... عبرت کدۂ ماضی پاسبانِ مستقبل
(مولانا منیب حسین)........................ ۳۴

نفس کی حقیقت
(مولانا ثاقب محمود)........................ ۴۲

مادہ قدیم یا حادث
(مولانا محمد ابراہیم)........................ ۴۶

علاماتِ قیامت سے متعلق معاصر روش
(مولانا واجد عالم)........................ ۵۰

علمی ورثے کا اِحیا
(مولانا سعد ڈیروی)........................ ۵۳

مجلسِ ادارت
- مولانا منیب حسین
- مفتی محمد انیس رشید
- سید شرف الدین احمد

مجلسِ مشاورت
- مفتی عمران حسن
- ڈاکٹر مفتی محمد شہزاد شیخ
- مولانا واجد عالم
- مولانا سید سلیمان شاہ
- ڈاکٹر محمد احد یار خان
- ڈاکٹر پروفیسر محمد عمیر

زیرِ اہتمام
معہد الشروق الاسلامی

A-204، حنیف سٹی، گلستان جوہر بلاک 17، کراچی +92 311 1246233
mahadalshorooqalislami
@gmail.com

انوارِ وحی

تو برائے بندگی ہے یاد رکھ!

﴿يَآيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ (سورۂ بقرہ:۲۱)

لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی، جس نے بنایا تم کو اور تم سے اگلوں کو، شاید تم پرہیزگاری پکڑو۔

معارفِ کاندھلویؒ: اے لوگو! اگر واقع میں تم انسان ہو اور اپنی انسانیت کی حفاظت چاہتے ہو، تو اپنے پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا، یعنی تم کو اور تمہارے اصول (آبا و اجداد) کو پردۂ عدم سے نکالا اور وجود کا عجیب وغریب خلعت تم کو پہنایا، تاکہ تم اس غیر مترقب نعمت اور عمدہ مرحمت کا شکر کرو، اور متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔ متقی بننے کا طریقہ یہی ہے کہ ہر وقت تم اس امر کو پیشِ نظر رکھو کہ وہ تمہارا پروردگار ہے۔ ایک لمحے اور ایک لحظہ کے لیے تم اس کی تربیت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اسی نے تم کو اور تمہارے آبا و اجداد کو جن سے تم پیدا ہوئے ہو، محض اپنی قدرت سے کتمِ عدم سے نکال کر وجود کا خلعت پہنایا ہے۔ اپنے امکان کو سوچو، تاکہ اس کا جواب معلوم ہو۔ اپنی عاجزی اور درماندگی کو سوچو، تو اس کا قادرِ مطلق ہونا معلوم ہو۔ اپنی ذلت وخواری کو سوچو، تو اس کا عزیزِ مطلق اور ذوالجلال والاکرام ہونا معلوم ہو۔ اپنے مملوک ہونے کو سمجھو، تاکہ اس کا مالک ہونا سمجھ میں آئے۔ علیٰ ہذا القیاس غایتِ محبت اور نہایتِ تعظیم واجلال کے ساتھ انتہائی تذلل کا نام عبادت ہے۔ مطلق محبت، مطلق تعظیم اور مطلق تذلل کا نام عبادت نہیں۔ اسی وجہ سے اولاد کی محبت، اور والدین واساتذہ کی تعظیم، اور ان کی تواضع عبادت نہیں کہلائے گی۔ تمام عالم عبادت ہی کے لیے پیدا کیا گیا اور سب سے پہلے انبیا علیہم السلام نے اسی کی دعوت دی۔

(معارف القرآن از مولانا محمد ادریس کاندھلوی قدس سرہٗ، ۱/۹۵)

ابو تمیم

وہ ایک ہے

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما: لَمَّا بَعَثَ النَّبِيُّ ﷺ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ إِلىٰ نَحْوِ أَهْلِ الْيَمَنِ، قَالَ لَهُ: "إِنَّكَ تَقْدَمُ عَلىٰ قَوْمٍ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ، فَلْيَكُنْ أَوَّلَ مَا تَدْعُوْهُمْ إِلىٰ أَنْ يُوَحِّدُوا اللّٰهَ تَعَالىٰ". (رواه البخاري)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا، تو ان سے فرمایا: تم اہلِ کتاب میں سے ایک قوم کے پاس جارہے ہو، اس لیے سب سے پہلے انہیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بلانا۔

درس: ''توحید'' یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو خدا و معبود ماننا، اس کے یکتا ہونے کا یقین رکھنا اور اس کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ کرنا، ایمان کی بنیاد اور اُخروی کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے ۹ ہجری میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بالائی یمن بھیجا، تو انہیں تاکید فرمائی کہ وہاں پہنچ کر یہود کو دعوت دیں، تو سب سے پہلے توحید کی جانب بلائیں۔

اقرارِ توحید کا مطلب شرک سے بیزاری ہے۔ چوں کہ یہود نے (نعوذ باللہ!) حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مان لیا تھا، اس لیے اہلِ کتاب ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے انہیں توحید کی دعوت دینے کا حکم فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اپنے آپ کو ''موحِّد'' کہہ لینا کافی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بندہ بننے کے لیے توحید کے تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہے، جن میں سب سے پہلے شرک سے براءت ہے۔

یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ بندوں کا اوّلین فریضہ اپنے خالق اور منعمِ حقیقی کی پہچان ہے۔ یہ پہچان دو طرح سے ممکن ہے۔ پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے سے متعلق سچے خبر رساں (مخبرِ صادق) یعنی پیغمبر ﷺ کی بات پر یقین کرلیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی کو خدا کا پیغام نہ پہنچ سکا ہو، تو وہ غور و فکر کرے کہ کائنات کا یہ اتنا بڑا نظام کیسے چل رہا ہے؟

دنیا میں ایک چھوٹی سی فیکٹری یا ادارہ بغیر کسی بانی کے وجود میں نہیں آ سکتا، بغیر کسی مدیر و منتظم کے چل نہیں سکتا، تو یہ چاند، سیارے، سورج، ستارے، کہکشائیں اور افلاک کس طرح بنے اور کیسے سرگرم ہیں؟ ایک اینٹ کسی کے بن بنائے نہیں بنتی، تو اس آسمان تلے موجود اتنے بڑے بڑے اجرامِ فلکی کیسے وجود میں آ گئے؟ ہیرا، یاقوت اور زُمرد کسی جوہری کی مہارت کے بغیر نہیں ترشتے، تو اتنی بڑی کائنات اس حسن و توازن کے ساتھ کیسے قائم و دائم ہے؟ بلکہ انسان اتنی دور کیوں جائے، خود اپنے ہی وجود میں غور کرے کہ میں کس طرح عدم سے وجود میں آ گیا؟ نظر تک نہ آنے والے جرثومے سے گوشت پوست کا باشعور و متحرک انسان کیسے بن گیا؟ اس غور و تدبر سے وہ لامحالہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ تمام چیزوں کا کوئی خالق ہے اور وہ ایک ہی ہے۔

خدا تعالیٰ کے یکتا ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر دو یا اس سے زائد خدا ہوتے، تو ان میں کہیں نہ کہیں اختلافِ رائے ضرور ہوتا، جس سے کائنات کے نظام میں کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی ضرور رخنہ اور تعطل آتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ افلاک میں ہر شے اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے اور دنیا میں قدرت کے نظام ہمیشہ سے اپنی ڈگر پر چل رہے ہیں۔

توحید فطری اور بدیہی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ثابت کرنے والے یہود ہوں، تثلیث کے قائل مسیحی ہوں یا کروڑوں دیوی دیوتاؤں اور اوتاروں کے آگے جھکنے والے ہندو، سب کے دلوں کے نہاں خانوں میں خدا کی وحدانیت موجود ہے، لیکن انہوں نے اپنے سینوں پر شرک کے بھاری پتھر رکھ کر اسے دبا رکھا ہے، زبان اور جوارح کو اس کی مخالفت پر آمادہ کر رکھا ہے، لیکن جب ان پر کوئی ایسی اُفتاد پڑتی یا مصیبت نازل ہوتی ہے، جسے وہ خود دور نہیں کر سکتے، تو زبانِ حال سے اقرار کرتے ہیں کہ ان کے تراشیدہ معبود اپنی حقیقت میں راکھ و غبار ہیں اور ان کے دل پکار اٹھتے ہیں کہ وہ ایک ہے۔ وہ ایک ہے۔

پُرفتن دور میں علم الکلام کے اِحیا کی ضرورت

اداریہ

اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو یہ عظیم نعمت پہنچانے کے لیے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث کیے۔ ان تمام برگزیدہ ہستیوں کا دین اسلام ہی تھا، صرف شریعتوں میں حسبِ اقوام اختلاف تھا۔ یہ دین حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے قیامت تک آنے والے ہر انسان کے لیے ذریعۂ نجات ہے، خاص طور پر اس کا وہ جز جسے ''عقیدہ'' کہا جاتا ہے، اس کی بنیاد اور رکنِ اعظم ہے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> شریعت کے دو جز ہیں: ایک اعتقادی اور ایک عملی۔ اعتقاد دین کی اصل ہے اور عمل اس کی فرع ہے..... عقائد اسلام کی بنیاد ہیں، ایک عقیدہ بھی خراب اور فاسد ہو گیا، تو اسلام کی عمارت خراب ہو گئی۔ (عقائدِ اسلام، ادارۃ المعارف کراچی، ۱۴۴۱ھ، ص: ۳۲، ۳۳)

کسی بھی عمارت کی اساس کو کمزور کر دیا جائے، تو اس کا وجود باقی کیسے رہ سکتا ہے؟! اسی بنا پر اُمت نے چودہ سو سال سے اسلام کی اعتقادی سرحدوں پر سخت پہرے لگا رکھے ہیں۔ علمائے اہلِ سنت نے اس غرض سے ایک فصیل کھڑی کی ہے، جسے علم الکلام کہتے ہیں اور یہ مسلمانوں کی علمی روایت کے انتہائی دقیق پہلوؤں میں سے ایک ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہ تھا۔ آپؐ کے وصال پُرملال کے بعد اوّلین اختلاف ''مسئلۂ امامت'' میں ہوا، جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے احسن طریقے سے رفع کر دیا، تاہم ان کے بعد خواہشات کے پجاریوں نے اس مسئلے کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اعتقادی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور یوں ''امامت''، عملی دائرے میں ہونے کے باوجود علم الکلام کا اہم باب بن گیا۔

فتوحات کے نتیجے میں قلمروئے اسلام کو وسعت ملی، تو مسلمان معاشروں میں دنیاوی علوم وفنون اور تہذیبوں کے علمبردار اہلِ فارس، روم اور یونان کی مداخلت شروع ہو گئی۔ فلسفے کی

بڑی کتب کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا، جس کے نتیجے میں فلسفیانہ پیچیدگیوں نے کمزور اور سادہ لوح مسلمانوں کے عقائد پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ اس صورت حال میں اُمتِ مسلمہ کے علما اور مفکرین نے اس فکر و فلسفے کو پڑھنے اور سمجھنے کا بیڑا اٹھایا، تاکہ مسلمانوں کے عقائد و افکار کو شکوک و شبہات سے بچایا جا سکے۔ اسلامی درس گاہوں میں منطق، فلسفہ، جدل اور کلام جیسے علوم باقاعدہ پڑھائے جانے لگے، اور راسخ فی العلم زعمائے ملت نے نقلی و عقلی میدان میں فلسفے اور گھس پیٹھیے باطل افکار کو شکست دی۔ البتہ انہیں درس گاہوں میں بعض لوگ عقل کی رو میں بہہ گئے اور عقائد کی جولان گاہ میں خطرناک ٹھوکریں کھا کر مسلمانوں کی جماعت سے نکل گئے۔ یہ لوگ قدریہ، جہمیہ، معتزلہ، خوارج اور روافض کے ناموں سے مشہور ہوئے۔ علامہ بیاضی رحمہ اللہ کے مطابق اہلِ سنت میں علم الکلام کے اوّلین سرخیل امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تھے۔ (اشارات المرام من عبارات الامام، مکتبہ زمزم کراچی، ۱۴۴۲ھ، ص: ۱۹)
عباسیوں کے دور میں خلقِ قرآن کا مسئلہ کھڑا ہوا، تو امام اہلِ سنت احمد بن حنبل رحمہ اللہ صاحبِ عزیمت مجاہد کی مانند میدان میں کود پڑے۔ ان کے بعد امام ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ نے معتزلہ کا ناطقہ بند کر کے علمی حلقوں سے ان کی سطوت ختم کر دی۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے فلسفۂ یونان کا بطلان کر کے عقلیت کے فتنے کو شکست دی، جب کہ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے دینِ اکبری کے تار پود بکھیرے۔ انیسویں صدی عیسوی میں مغربی استعمار نے عالمِ اسلام پر پنجے گاڑھے، تو مسلمانوں پر علمی، ثقافتی اور تہذیبی یلغار بھی کر دی۔ اس موقع پر بھی علمائے اُمت جہاد اور کلام کے میدانوں میں سینہ سپر نظر آئے۔

اس تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علما کبھی بھی اپنے دور کے فتنوں سے غافل نہیں رہے۔ انہوں نے اپنی کلامی روایت کو اسی طرح حرزِ جان بنائے رکھا، جس طرح قرآن، حدیث، فقہ اور لغت کو اپنی علمی سرگرمیوں کا محور بنایا، تاہم اب مسلمانوں کو استعمارِ جدید کا سامنا ہے، جو ظُلماتٌ بعضُہا فوقَ بعض کی مانند ہے۔ ہر روز اس کا ایک ورق پلٹتا ہے اور نئی تاریکی برآمد ہوتی ہے، جو مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کرتی ہے۔ فتنے بارش کی طرح برس رہے ہیں۔ مٹھی بھر اہلِ علم ایک مغالطے کو سمجھنے کی سعی میں ہوتے ہیں کہ مغربیت کی کوکھ سے نئی

باطل فکر یا نظریہ نمودار ہو جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس فن کے زیادہ سے زیادہ ماہرین تیار کیے جائیں، جس کی یہی صورت ہے کہ علم الکلام کی قدیم روایت کا اِحیا اور اس کی روشنی میں علم الکلام جدید کو مدوّن کیا جائے۔

آج کی ہر گمراہی کسی نہ کسی صورت میں ماضی کی ضلالتوں کا پَرتو ہے، اس لیے ہمیں لامحالہ اپنی کلامی روایت سے جڑنا ہوگا۔ اسی تناظر میں حکیم الامت مجددِ ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ۱۳۲۷ھ بہ مطابق ۱۹۰۹ء میں اپنے ایک وعظ میں اس پر زور دیا تھا، جسے بعد میں ''الانتباہات المفیدہ'' کے نام سے شائع کرایا۔ اس میں حضرت نے فرمایا ہے:

> اس زمانے میں جو بعض مسلمانوں میں اندرونی دینی خرابیاں عقائد کی اور پھر اس سے اعمال کی پیدا ہوگئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں، ان کو دیکھ کر اس کی ضرورت اکثر زبانوں پر آرہی ہے کہ علمِ کلام جدید مدوّن ہونا چاہیے ..... گو شبہات کیسے ہی اور کسی زمانے میں ہوں، مگر ان کے جواب کے لیے بھی وہی علمِ کلام قدیم کافی ہو جاتا ہے۔
>
> (الانتباہات، مکتبۃ البشریٰ کراچی، ۱۴۴۲ھ، ص: ۵)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف نے اس علم کو اس انداز میں مدوّن کیا ہے کہ ہر وہ باطل فکر یا نظریہ جو انسان کی ناقص عقل کا پیدا کردہ ہے، علم الکلام قدیم کے شکنجے میں آکر دم توڑ دیتا ہے۔ اس کے اصول وقواعد ہر باطل کا گلا گھونٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ فلسفہ جب بھی دین کے مقابل آکر کھڑا ہوا، علم الکلام نے اسے پنپنے نہیں دیا۔ فرقِ باطلہ کی تاریخ پر مسلمانوں کا علمی ورثہ اس کا واضح ثبوت ہے، لیکن آج کوئی ان کتابوں کو کھول کر تو دیکھے۔

یہی وجہ ہے کہ ماضی قریب میں علمائے ہند نے علم الکلام قدیم کو اپنے مقاصد میں سرفہرست رکھا اور انیسویں صدی کے اواخر میں استعمار کی پشت پر سوار ہو کر آنے والی عیسائی مشنریوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اسی طرح استشراق واستغراب کی دلدلوں میں پنپنے والی خاردار جھاڑیوں قادیانیت، انکارِ حدیث اور نیچریت وغیرہ کو اکھاڑ پھینکا، تاہم چند دہائیوں سے اس اہم علم کی طرف توجہ نہایت کم ہوگئی ہے اور اس فن کی صرف ایک متوسط کتاب ''شرح العقائد النسفیہ'' درسِ نظامی کا حصہ ہے۔ اس علم کے مبادی سے ناآشنا ہونے اور طلبہ کے اسے مشکل

سمجھنے کے باعث فاضلین اوراس علم میں دوری بڑھتی جارہی ہے۔ مادے کے حدوث وقدم کی بحث ہو یا ذات وصفاتِ باری تعالیٰ پر گفتگو، نبوت اور آخرت سے متعلق کلام ہو یا دیگر عقائدِ اسلام پر بات نوجوان علما کو جوئے شیر لانے کے مترادف معلوم ہوتی ہے۔

مادیت، ظاہر پرستی، عقل پسندی، سائنس پرستی، تشکیک، الحاد، سیکولرازم، لبرل ازم، صنفی مساوات، انسان پرستی، آزادیٔ اظہار، انکارِ ضروریاتِ دین اور بین المذاہب ہم آہنگی سمیت مختلف گمراہیاں عوام کی رگوں میں خون کی مانند سرایت کررہی ہیں، جب کہ خود ہمارے فاضلین کو استشراق اور استغراب جیسے خطرات کا سامنا ہے، جن کے باعث ان میں روایت سے دوری اور سلف پر عدمِ اعتماد جیسے رجحانات پیدا ہورہے ہیں۔ ان حالات میں اہلِ سنت کے کلامی مکاتبِ فکر اشاعرہ اور ماتریدیہ کی کتب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے ساتھ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور قاری محمد طیب قاسمی رحمہم اللہ کی زندگیاں، ان کی کلامی خدمات اور علمی ورثے کو مشعلِ راہ بنانا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر دورِ جدید کی بظاہر لامتناہی گمراہیوں کا راستہ روکنا ممکن نہیں۔ اس بنا پر علم الکلام کا اِحیا وقت کی اہم ضرورت ہے اور ہمیں اس سے مزید تغافل نہیں برتنا چاہیے۔

نبیؐ کی پیروی ہی میں سراسر سرفرازی ہے

مفتی محمد انیس رشید
مشرف تخصص فی العقیدۃ والفکر الاسلامی

اسلام ایک کامل اور مکمل دین ہے۔اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہے۔تمام حالات اور مواقع کے لیے اسلام کی واضح ہدایات موجود ہیں۔اسلام کی تعلیمات اور ہدایات اتنی جامع و مانع ہیں کہ کوئی بھی شخص اسلامی احکام اور شعائر پر عمل پیرا ہونا چاہے،تو اس کے لیے اس میں راہِ عمل موجود ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ﴿الْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (مائدہ:۳) میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ اسلام نے اپنے اندر دینی ودنیوی کمالات اور منافع کو اس جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ ہر شخص اس میں اپنے لیے نجات اور فلاح کی راہ پاسکتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم چاہے اس کا تعلق ایشیا سے ہو یا افریقا سے، یورپ وامریکا سے ہو یا نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا سے، اگر راہِ حق کا متلاشی ہو تو اس کو اسلام کے دامن میں پناہ ملتی ہے۔اگر کوئی شخص متمدن دنیا کی چکا چوند اور چمک دمک سے ہٹ کر حق کا متلاشی اور حق کا جویا ہو کے راہِ حق کی تلاش میں نکلے، تو اس کو اسلام کے دامن میں ہی پناہ ملتی ہے۔وجہ اس کی ایک ہی ہے کہ اسلام امن اور حق کا دین ہے۔ہر شخص اس کے دامن میں پناہ حاصل کرسکتا ہے۔اسلام کے کمالات اور اس کی جامعیت راہِ حق کے جویا کو دینِ حق کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔

> یہ اُمت صرف اسی راستے سے ٹھیک ہو سکتی ہے، جس طریق اور راستے سے اس کے شروع کے لوگوں نے صلاح اور بھلائی پائی۔

جب اسلام کے کمالات اور لازوال نفع اس قدر عام وتام ہے اور غیر مسلم بھی اس کی خوشہ چینی پر مجبور ہوتے ہیں، تو مسلمانوں کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ غیر مسلموں جیسے یہود وہنود، عیسائی، پارسی، مجوسی اور دہریے کی پیروی اور اتباع کریں۔حالاں کہ اگر بغور دیکھا جائے اور کھلے دل ودماغ سے غور کیا جائے کہ بندۂ مؤمن پر اللہ تعالیٰ کی کتنی نعمتیں اور انعامات برس رہے ہیں، اور ہر ہر قدم پر اللہ

تعالیٰ کی مہربانیوں کی برسات اس پر ہو رہی ہے، تو دوسروں کے ناقص اور کمزور آرا و خیالات سے خوشہ چینی کی کیا ضرورت ہے۔ اغیار جو خود راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اللہ کے دین کے دشمن ہیں، ان کے پاس جو رسوم و رواج اور روایات ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيرًا ۝﴾ (احزاب:۲۱)

البتہ تمہارے لیے رسول اللہ میں اچھا نمونہ ہے، جو اللہ اور قیامت کی اُمید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝﴾ (حشر:۷)

جو کچھ تمہیں رسول دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

لَا يُصْلِحُ آخِرَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا مَا أَصْلَحَ أَوَّلَهَا. (الشفاء بتعريف حقوق المصطفى ﷺ، القاضي أبو الفضل عياض اليحصبي، دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت لبنان)

یہ اُمت صرف اسی راستے سے ٹھیک ہو سکتی ہے، جس طریق اور راستے سے اس کے شروع کے لوگوں نے صلاح اور بھلائی پائی۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اس قوم کے ابتدائی لوگوں نے توحیدِ خالص اور اللہ کے احکام پر عمل کر کے کامیابی سمیٹی تھی۔ ان لوگوں نے اللہ کے حقوق ادا کیے، اللہ کے راستے میں جہاد کیا، اور اللہ اور اس کے رسول پر مضبوطی کے ساتھ ایمان لائے۔ اس اُمت کے اولین لوگوں نے اس طرح کامیابی حاصل کی۔ لہٰذا اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ اُمت اس وقت تک کامیابی کے جھنڈے نہیں گاڑ سکتی، جب تک اس اُمت کے اندر اللہ کی وحدانیت کا یقین نہ پیدا ہو جائے اور اللہ کے اوامر کو نہ مانے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے حقوق کی ادائیگی کرے،

اس کے راستے میں جہاد کرے، اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ عبادت اللہ کے واسطے کرے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ اس طرح اس اُمت کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ اگر یہ اُمت اس راستے کو اختیار نہیں کرتی ہے، تو اس کی اصلاح اور کامیابی ممکن نہیں ہے۔

عَنْ جَابِرٍ ﷺ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّ أَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ. (السنن الكبرى، أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني النسائي، كيف الخطبة، رقم الحديث:۱۷۹۹- بيروت)

سنن نسائی میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے بہترین راستہ جناب نبی کریم ﷺ والا راستہ ہے۔

یہ معلوم ہونا نہایت ضروری ہے کہ قرآن وسنت کو مضبوطی سے پکڑے رہنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہیں گے، تو ہمارے لیے کتاب اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہنا آسان ہوجائے گا۔ جناب نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال سے جو کچھ ثابت ہے یہ سنت ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ کی سیرت پر عمل پیرا ہونا بھی سنت ہے۔ نبی کریم ﷺ کے عالی مرتبت اخلاق کو اپنانا سنت ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ کی صورت اور سیرت صاف ستھرے طریقے سے بے غبار اور واضح انداز میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ آپ ﷺ کے بلند اخلاق اور سیرت کے بارے میں علمائے سیرت نے بہت تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ کی سیرت دیگر تمام انبیائے سابقین کی نسبت بہت تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ سے وفات تک کی پوری تفصیل سیرت نگاروں نے قلم بند کی ہے۔ آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت، بچپن،

اگر کوئی شخص قرآن وسنت کو چھوڑ کے خواہشات اور بدعات کی پیروی کرے اور گمراہیوں کے سمندر میں پڑ کے راہ حق سے گمراہ ہوجائے اور قرآن وسنت کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر زیغ وضلال اور گمراہیوں میں پڑا رہے، اور شبہات وشہوات کے بحر ظلمات میں خود کو ڈال دے تو اس کو کوئی جہنم سے نجات نہیں دلا سکے گا۔

اخلاق وسیرت، ازواج مطہرات، بنات، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف، دوسروں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آنے والے مختلف حالات وواقعات، جنگیں، سرایا، اسلام سے پہلے اور بعد کے حالات اور تمام احکام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے لے کے اپنی اُمت کو بیان کیے، شریعت کی خصوصیات اور تمام تر تفصیلات ہم تک مستند طریقے سے منقول ہوئی ہیں۔

اگر کوئی شخص کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے، تو یہ شخص فتنوں سے اور گمراہیوں سے محفوظ ہو جائے گا۔ فتنوں کی مختلف قسمیں ہیں اور اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ شہوات، خواہشات اور گمراہیوں کے فتنے ہیں، ان تمام فتنوں کی وجہ سے لوگ صراطِ مستقیم اور راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔ راہِ مستقیم سے بھٹکنے کی وجہ سے ان کے اندر کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے بعد یہ لوگ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے دور ہو جاتے ہیں۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ ﷺ: "قَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهُ إِنْ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ: كِتَابَ اللهِ، وَأَنْتُمْ مَسْؤُوْلُوْنَ عَنِّيْ، فَمَا أَنْتُمْ قَائِلُوْنَ؟" قَالُوْا: نَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَأَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ. (سنن أبي داود، باب صفة حجة النبي ﷺ، رقم الحديث: ١٩٠٥ - دار الرسالة العالمية)

سنن ابوداود میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہارے پاس ایسی چیز چھوڑ کے جا رہا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑے رہو تو تم کبھی بھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ ہے کتاب اللہ۔ اس کے بعد فرمایا: تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اس موقع پر تم کیا جواب دو گے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا: ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے مکمل پہنچا دیا، آپ نے پورا حق ادا کر دیا اور آپ نے مکمل خیر خواہی کی۔

حدیث پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ کتاب وسنت کو مضبوط تھامے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص گمراہیوں اور خواہشات کے سمندر میں غوطہ زنی کرے، تو اس کے لیے

نجات کی کوئی راہ نہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن وسنت کو چھوڑ کے خواہشات اور بدعات کی پیروی کرے، اور گمراہیوں کے سمندر میں پڑ کے راہِ حق سے گمراہ ہوجائے، اورقرآن وسنت کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر زیغ وضلال اور گمراہیوں میں پڑا رہے، اورشبہات وشہوات کے بحرِ ظلمات میں خودکو ڈال دے، تو اس کو کوئی جہنم سے نجات نہیں دلا سکے گا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ سنت پر عمل کرنا ایسا ہی ہے جیسے ڈوبنے سے بچنے اور نجات حاصل کرنے کے لیے سفینۂ نوح پر سوار ہوجائے، اور جو شخص اس سفینے کو چھوڑ کے پیچھے رہ جائے اور یہ سمجھے کہ اس کے بغیر بھی نجات مل جائے گی تو یہ خام خیالی ہے۔

> **جناب نبی کریم ﷺ کے راستے کو اپنا کر ہی ذلت اور رسوائی سے بچا جاسکتا ہے۔ اس وقت ہماری جو کمزوری ہے اور ہمیں جس رسوائی کا سامنا کرنا پڑرہا ہے، اس کی وجہ صرف اور صرف نبی کریم ﷺ کی سنت سے دوری ہے۔**

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سنت کی کس قدر پیروی کرتے تھے اوراس بات سے کتنا خوف زدہ رہا کرتے تھے کہ اس کو اگر چھوڑ دے تو دل کجی کی طرف مائل ہوجائے گا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ آپ فرماتے تھے کہ جناب نبی کریم ﷺ جن امور کو انجام دیا کرتے تھے، میں ان میں سے کسی بھی چیز کو چھوڑنے والا نہیں ہوں:

وَعَنْ أَبِيْ بَكْرٍ الصِّدِيْقِ رضي الله عنه قَالَ: لَسْتُ تَارِكًا شَيْئًا كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَعْمَلُ بِهِ إِلَّا عَمِلْتُ بِهِ، إِنِّيْ أَخْشٰى إِنْ تَرَكْتُ شَيْئًا مِنْ أَمْرِهِ أَنْ أَزِيْغَ. (الاعتصام للشاطبی:۱/۶۰)

کیوں کہ یہی مؤمن کی شان ہے، جو قرآنِ کریم میں بیان کی گئی ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝﴾ (احزاب:۳۶)

اور کسی مؤمن مرد اور مؤمن عورت کو لائق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم

دے، تو انہیں اپنے کام میں اختیار باقی رہے، اور جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی تو وہ صریح گمراہ ہوا۔

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝﴾ (نسا:۶۵)

سو تیرے رب کی قسم ہے! یہ کبھی مؤمن نہیں ہوں گے، جب تک کہ اپنے اختلافات میں تجھے منصف نہ مان لیں، پھر تیرے فیصلے پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور خوشی سے قبول کریں۔

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝﴾ (شوریٰ:۵۲،۵۳)

اور اسی طرح ہم نے آپؐ کی طرف اپنے حکم سے قرآن نازل کیا۔ آپؐ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے، اور لیکن ہم نے قرآن کو ایسا نور بنایا ہے کہ ہم اس کے ذریعے سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بے شک آپؐ سیدھا راستہ بتاتے ہیں۔ اس اللہ کا راستہ جس کے قبضے میں آسمانوں اور زمین کی سب چیزیں ہیں۔ خبردار! اللہ ہی کی طرف سب کام رجوع کرتے ہیں۔

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝﴾ (نور:۵۴)

کہہ دو اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرماں برداری کرو، پھر اگر منہ پھیرو گے تو پیغمبر پر تو وہی ہے جس کا وہ ذمے دار ہے اور تم پر وہ ہے جو تمہارے ذمے لازم کیا گیا ہے اور اگر اس کی فرماں برداری کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول کے ذمے صرف صاف طور پر پہنچا دینا ہے۔

کوئی بھی شخص خود کو قولاً وفعلاً قرآن وسنت کا پابند بنالیتا ہے، تو وہ حکمت کی باتیں کرنے لگتا ہے اور جو شخص خود کو قولاً وفعلاً ہویٰ اور خواہشات کے تابع بنالیتا ہے، وہ بدعت اور گمراہی کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا: ﴿وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا﴾۔

جناب نبی کریم ﷺ کے راستے کو اپنا کر ہی ذلت اور رسوائی سے بچا جاسکتا ہے۔ اس وقت ہماری جو کمزوری ہے اور ہمیں جس رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس کی وجہ صرف اور صرف آپ ﷺ کی سنت سے دوری ہے۔ ہم نے نجات کا راستہ ایسی چیزوں کو اپنانے میں خیال کیا ہے جو ہمارے نبیؐ کے راستے سے ہٹ کر ہے۔ ہم نے آپ ﷺ کی سنتوں کے خلاف عمل کر کے کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝﴾ (نور: ۶۳)

سو جو لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں اس سے ڈرنا چاہیے کہ ان پر کوئی آفت آئے یا ان پر کوئی دردناک عذاب نازل ہو جائے۔

اس آیت سے بھی پتا چلتا ہے کہ دنیا وآخرت میں عزت، رفعت اور سربلندی جناب نبی کریم ﷺ کی پیروی میں ہے۔ جب کہ ایک جگہ ارشادِ باری ہے:

﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝﴾ (منافقون: ۸)

اور عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مؤمنین ہی کے لیے ہے، لیکن منافق نہیں جانتے۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا﴾ (فاطر: ۱۰)

جو شخص عزت چاہتا ہو، سو اللہ ہی کے لیے سب عزت ہے۔

اللہ ورسولؐ کے احکام کی مخالفت سے دونوں جہانوں میں ذلت اور رسوائی ملتی ہے۔

سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝﴾ (انعام: ۱۵۳)

اور بے شک یہی میرا سیدھا راستہ ہے، سو اسی کا اتباع کرو، اور دوسرے راستوں پر مت چلو، وہ تمہیں اللہ کی راہ سے ہٹا دیں گے۔ تمہیں اسی کا حکم دیا ہے، تا کہ تم پرہیز گار ہو جاؤ۔

رسول اللہ ﷺ کی پیروی سے متعلق ذخیرۂ حدیث میں بھی ہمارے لیے رہنمائی ہی رہنمائی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے:

عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ: صَلَّى بِنَا رَسُوْلُ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا فَوَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ، فَقَالَ قَائِلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَأَنَّ هَذِهِ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ، فَمَاذَا تَعْهَدُ إِلَيْنَا؟ فَقَالَ ﷺ: أُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، وَإِنْ عَبْدًا حَبَشِيًّا، فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّيْنَ الرَّاشِدِيْنَ، تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ. (سنن أبي داود، باب في لزوم السنة، رقم الحديث: ۴۶۰۷، والترمذي، باب ما جاء في الاخذ بالسنة واجتناب البدع، رقم الحديث: ۲۶۷۶، وابن ماجه، رقم الحديث: ۴۲)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ ہمیں ایک روز نماز پڑھانے کے بعد ہماری طرف متوجہ ہوئے اور پھر ہمیں بہت بلیغ انداز میں نصیحت فرمائی۔ اس نصیحت کا اثر تھا کہ ہماری آنکھوں سے آنسوں جاری ہو گئے اور اس کا اثر یہ بھی ہوا کہ ہمارے دل بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئے۔ اس موقع پر کسی کہنے والے نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ نصیحت تو الوداعی نصیحت معلوم ہو رہی ہے، آپ ہمیں کس چیز کا پابند بناتے ہیں؟ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ سے ڈرنے اور اطاعت وفرماں برداری کی وصیت کرتا ہوں، اگر چہ

تمہارے اوپر ایک حبشی غلام ہی حکمران کیوں نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ تم میں سے جو بھی میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ اس وقت تم میری پیروی کرنا اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی پیروی کرنا۔ تم لوگ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو اور اس کو اپنے دانتوں سے دبا کے رکھو۔ تم لوگ نئی چیزوں سے بچو، وجہ یہ ہے کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

سنت پر مضبوطی سے کاربند رہنا اعمال اور طاعات کی قبولیت کا سبب ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونا مقبولیت کی علامت ہے، تاہم اس کی مخالفت مردود یعنی مسترد ہے۔ ''بخاری شریف'' میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ ﵂ أَنَّ رَسُوْلَ الله ﷺ قَالَ: مَنْ عَمِلَ عَمْلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فُهُوَ رَدٌّ. (صحيح البخاري، رقم الحديث:٧١١٨)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کوئی بھی عمل ہمارے طریقے کے خلاف کیا تو وہ مردود اور نامقبول ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ عمل جو خلاف شرع ہو وہ اللہ کے نزدیک نامقبول اور مردود ہے اور ہر وہ عمل جو موافقِ شرع ہو وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔

انسان کے لیے بدعت میں پڑنے کے بجائے سنت پر عمل کر کے میانہ روی اختیار کرنا بہتر ہے، اور اس کے لیے بہت زیادہ کوشش، محنت اور جدوجہد کرے۔ قرآن کریم میں اس کو اس طرح بیان کیا ہے:

> **کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو مضبوطی سے تھامے رہنے میں مکمل سعادت اور نیکی ہے۔ بغیر اتباعِ رسول ﷺ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل نہیں ہو سکتی۔**

﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (هود:٧)

کہ تمہیں آزمائیں کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ عمل میں اخلاص ہو اور صحیح بھی ہو۔ چناں چہ اگر کوئی شخص اپنے عمل میں اخلاص بھی پیدا کر لے، لیکن عمل صحیح نہ ہو تو اس کا یہ عمل مقبول نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا عمل تو صحیح ہو، لیکن اس میں اخلاص نہ ہو تب بھی اس کا یہ عمل مقبول نہیں ہوگا۔ چناں چہ وہ عمل جو صرف اللہ

کے لیے ہو اور درست بھی ہو تو یہ سنت کے مطابق عمل ہوا۔ اللہ کے لیے عمل ہونے اور عمل میں اخلاص پیدا کرنے کے لیے جناب نبی کریم ﷺ کی اتباع اور پیروی ضروری ہے۔ علم اگر بلا عمل نافع ہوتا، تو اللہ تعالیٰ اہلِ کتاب کے علما اور احبار کی مذمت نہ فرماتے۔ اسی طرح عمل بغیر اخلاص کے نافع ہوتا تو اللہ تعالیٰ منافقین کی مذمت نہ فرماتے۔

سنت کو مضبوطی سے تھامے رہنے سے قیامت کے روز چہرے سیاہ نہیں ہوں گے۔ سنت کو مضبوطی سے تھامے رہنا بروزِ قیامت چہرہ سفید اور چمکدار رہنے کے اسباب میں سے ہے، جب کہ سنت کی مخالفت اور بدعت کا ارتکاب بروزِ قیامت چہرے کے سیاہ ہونے کے اسباب میں سے ہے۔

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ○ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○﴾

(آل عمران: ١٠٦، ١٠٧)

اس کی تفسیر میں حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وقوله تعالى: ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾ يعني: يوم القيامة، حين تبيض وجوه أهل السنة والجماعة، وتسودّ وجوه أهل البِدْعَة والفرقة، قاله ابن عباس رضي الله عنهما. (تفسير القرآن العظيم، للحافظ ابن كثير الدمشقي)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ﴾ سے اہلِ سنت والجماعت مراد ہے اور ﴿وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾ سے اہلِ بدعت مراد ہیں۔

سنت کو تھامے رہنا جناب نبی کریم ﷺ کے حوض سے پینے کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اور جناب نبی کریم ﷺ کے حوض سے بھگائے جانے سے نجات کا سبب ہے۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رضي الله عنه، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: إِنِّي فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ، مَنْ مَرَّ عَلَيَّ شَرِبَ، وَمَنْ شَرِبَ لَمْ يَظْمَأْ أَبَدًا، لَيَرِدَنَّ

عَلَيَّ أَقْوَامٌ أَعْرِفُهُمْ وَيَعْرِفُوْنِيْ، ثُمَّ يُحَالُ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ، فَأَقُوْلُ إِنَّهُمْ مِنِّيْ. فَيُقَالُ: إِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا أَحْدَثُوْا بَعْدَكَ. فَأَقُوْلُ: سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِيْ. (صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب في الحوض)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں حوض میں تمہارا منتظر رہوں گا، جو بھی میرے پاس سے گزرے گا وہ حوض سے پیے گا اور جو پیے گا اس کو کبھی پیاس نہیں لگے گی۔ میرے پاس ایسے لوگ بھی آئیں گے جنہیں میں جانتا اور وہ بھی مجھے پہچان لیں گے۔ اس کے بعد میرے اور ان کے درمیان رکاوٹ ڈال دی جائے گی۔ تو میں کہوں گا: یہ لوگ تو میرے ہیں۔ تو کہا جائے گا: ان لوگوں نے آپ کے بعد جن چیزوں کا ارتکاب کیا اس بارے میں آپ کو نہیں معلوم۔ تو میں کہوں گا: دور بھگاؤ، ان لوگوں کو، دور بھگاؤ جنہوں نے میرے بعد دین کو بدل ڈالا۔

سنت کو مضبوطی سے تھامنے سے آگ سے نجات ملے گی، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لے کر آئے اس کو اپنانے کا حکم قرآن کریم نے دیا، جیسا کہ سورۂ حشر کی آیت ۷ ماقبل میں ذکر کی جا چکی ہے اور حدیث میں آتا ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ، قَالَ: كُلُّ أُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى. قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ، وَمَنْ يَأْبَى؟ قَالَ: مَنْ أَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ أَبَى. (صحيح البخاري، رقم الحديث: ۷۲۸۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرا ہر امتی جنت میں داخل ہوگا، سوائے اس شخص کے جس نے انکار کیا۔ صحابہ کرام نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! کون انکار کرسکتا ہے؟ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا اور جو میری نافرمانی کرے گا تو اس نے انکار کیا۔

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ

سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ○﴾

(نسا:۱۱۵)

اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے بعد اس کے کہ اس پر سیدھی راہ کھل چکی ہو اور سب مسلمانوں کے راستہ کے خلاف چلے تو ہم اسے اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا ہے اور اسے دوزخ میں ڈال دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو مضبوطی سے تھامے رہنے میں مکمل سعادت اور نیکی ہے۔ بغیر اتباعِ رسول (ﷺ) اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل نہیں ہوسکتی۔ ابنِ قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''مدارج السالکین'' میں لکھا ہے:

وَلَا یُحِبُّكَ اللهُ إِلَّا إِذَا اتَّبَعْتَ حَبِیْبَهُ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا، وَصَدَّقْتَهُ خَبَرًا، وَأَطَعْتَهُ أَمْرًا، وَأَجَبْتَهُ دَعْوَةً، وَآثَرْتَهُ طَوْعًا، وَفَنِیْتَ عَنْ حُکْمِ غَیْرِهِ بِحُکْمِهِ، وَعَنْ مَحَبَّةِ غَیْرِهِ مِنَ الْخَلْقِ بِمَحَبَّتِهِ، وَعَنْ طَاعَةِ غَیْرِهِ بِطَاعَتِهِ، وِإِنْ لَمْ یَکُنْ ذٰلِكَ فَلَا تَتَعَنَّ، وَارْجِعْ مِنْ حَیْثُ شِئْتَ، فَالْتَمِسْ نَوْرًا، فَلَسْتَ عَلٰی شَيْءٍ. (۳/۳۷)

جب تک ظاہراً و باطناً، اللہ کے حبیب ﷺ کی پیروی نہیں کرو گے اس وقت تک اللہ تعالیٰ تم سے محبت نہیں کرے گا، اور اس وقت تک اللہ تعالیٰ تم سے محبت نہیں کرے گا جب تک اس کے حبیب ﷺ کی باتوں کو قبول نہ کرلو، آپ ﷺ کے احکام کی اطاعت نہ کرلو، آپ ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کرلو، آپ ﷺ کی اطاعت کو ترجیح نہ دو، آپ ﷺ کی باتوں کو دوسروں کی باتوں پر ترجیح نہ دو، دوسروں کی محبت پر آپ ﷺ کی محبت کو ترجیح نہ دو، دوسروں کی اطاعت پر آپ ﷺ کی اطاعت کو ترجیح نہ دو۔ اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو خود کو تھکانے کی ضرورت نہیں، اور جس کے پاس چاہو رجوع کرو اور وہاں جا کے نور تلاش کرو۔

﴿فَذٰلِکُمُ اللهُ رَبُّکُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ ○﴾ (یونس:۳۲)

یہی اللہ تمہارا سچا رب ہے حق کے بعد گمراہی کے سوا اور ہے کیا سو تم کدھر پھرے جاتے ہو۔

﴿اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ۝﴾

(دھر:۲۷)

بے شک یہ لوگ دنیا کو چاہتے ہیں اور اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو چھوڑتے ہیں۔

غرض رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہی ہمارے لیے مشعلِ راہ اور آپ ﷺ کی اتباع ہی ہمارے لیے واحد راہِ نجات ہے۔ آپ ﷺ ہمیں جس بات کا حکم دیں، ہم اسے بے چُوں چکُوں قبول کریں اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اس اُمت کے اوّلین گروہ نے اسی طرح فلاح پائی اور قیامت تک آنے والے اہلِ ایمان کی کامیابی اسی میں منحصر ہے۔ ہمارے اسلاف کی فکر بس یہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی حکم ٹوٹ نہ جائے، آپ ﷺ کی کوئی سنت چھوٹ نہ جائے، جب کہ اس دور میں اسلام اور اس کی تعلیمات کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا جا رہا ہے۔ دینِ حق اور نبیٔ برحق ﷺ کے حقوق سے لاپروائی کے باعث آج ہم زمانے میں رسوا ہیں اور ہمیں اس کی کوئی فکر بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اس روش کی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، تاکہ ہمیں ابدی کامیابی اپنے نام کر سکیں، کیوں کہ:

نبیؐ کی پیروی ہی میں سراسر سرفرازی ہے

آدابِ سیاست ❶

تلخیص وترتیب: مولانا فیاض احمد
شریک تخصص فی العقیدہ والفکر الاسلامی

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نوراللہ مرقدہ کی مایہ ناز تصنیف "الاعتدال فی مراتب الرجال" المعروف بہ "اسلامی سیاست" سے اخذ کردہ اصول، جو ہمارے دینی ودنیاوی طبقات کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

قطب الاقطاب محدثِ زمان شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ گزشتہ صدی ہجری کی ان نابغۂ روزگار شخصیات میں ہیں، جنہوں نے قطبِ عالم امام الاصول شیخ المشایخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ سے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ تک کی صحبت اٹھائی۔ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ سے قربت، بے تکلفی اور نوازشات کی انتہا نہ تھی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی نگاہ میں بھی مقام رکھتے تھے۔ ان بزرگوں کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ رحمہ اللہ کو جامعِ شریعت وطریقت بنایا تھا۔ اسلامی تعلیمات کی حکمتوں اور علتوں سے خوب واقف تھے۔ اس لیے تقسیمِ ہند کے وقت مسلمانوں میں ہونے والے اختلاف پر جو معاملات دیکھنے میں آئے، ان سے متعلق حضرت شیخ رحمہ اللہ سے بہت زیادہ سوالات کیے گئے اور ان رویوں پر شریعت کی رہنمائی مانگی گئی۔ انہوں نے ان تمام استفسارات کا جواب اپنی مایہ ناز کتاب "الاعتدال فی مراتب الرجال" المعروف بہ "اسلامی سیاست" میں تفصیل سے دیا ہے۔ اس کتاب میں حضرت شیخ رحمہ اللہ نے کچھ اصول بھی بیان کیے ہیں، جو اختلافِ رائے کے موقع پر شریعت کے تقاضے ہیں۔ درس کے دوران اندازہ ہوا کہ ان اصول کو کتاب سے کشید کر کے مستقل طور پر لکھنا اور مرتب کرنا انتہائی مفید رہے گا۔ یہ اصول ہمارے دینی طبقے کے لیے خاص طور پر اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں مصروف افراد کے لیے بالعموم مشعلِ راہ ہیں۔

اہلِ حق میں اختلاف حق اور باعثِ رحمت

۱۔اہلِ حق کی سیاسی جماعتوں کے درمیان فکری ونظریاتی اختلاف کا ہونا لازمی جز ہے،لہٰذا اس اختلاف پر تعجب وحیرت کرنا اسلامی تاریخ اور اسلامی تعلیمات سے نابلد ہونے کی علامت ہے۔

۲۔علمائے دین کا آپس میں اختلاف اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت ہے، کیوں کہ اختلاف کے بعد اس مسئلے میں شدت کی نوعیت ختم ہو جاتی ہے اور گنجایش مل جاتی ہے۔

۳۔اہلِ حق کے درمیان ایسے اختلاف سے ہمارے لیے وسعت کی راہیں کھلتی ہیں،جس میں ہمارا فائدہ ہے،لہٰذا اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

۴۔علما کے درمیان اختلاف کوئی نئی بات نہیں، بلکہ انبیائے کرام علیہم السلام کی شرائع کا اختلاف بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔اصول میں تمام اَنبیا کی شرائع موافق ہیں۔البتہ فروعات میں اختلاف شدید رہا ہے اور اسی طرح دوسری جزئیات میں بھی اختلاف رہا۔

۵۔اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتنی ہی مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہوا۔سب سے مشہور اختلاف قیدیوں کے متعلق حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا ہوا۔

۶۔زمانۂ نبوت کے بعد بھی حضرات شیخین رضی اللہ عنہما میں دیگر معاملات میں اختلاف ہوا۔حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا لشکر روانہ کرنے میں اختلاف ہوا، مانعینِ زکوٰۃ سے قتال میں اختلاف ہوا وغیر ذلک۔

۷۔پھر حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے علاوہ فقہائے صحابہ رضی اللہ عنہم کا اختلاف بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے،جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی سختی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی نرمی تمام مسائل میں مشہور ہے۔

۸۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد یہ سلسلہ تابعین وتبع تابعین فقہا و مجتہدین میں چلا آرہا تھا۔لہٰذا اس اختلاف سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ یہ اختلاف اللہ کی رحمت ہے۔(ص:۱۷۸-۱۸۸)

۹۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر اکابرامت کا آپس میں اختلاف من مانی کے لیے نہیں اعلائے حق کے لیے تھا۔وہ اپنے موقف میں شدت اختیار نہیں کرتے تھے۔اپنی بات کہہ دیتے تھے،خواہ کوئی عمل کرے یا نہ کرے اور جو عمل نہ کرے اس سے دل تنگ نہیں کرتے تھے۔(ص:۱۸۸-۱۸۹)

۱۰۔علما کا اختلاف مذموم نہیں اور نہ ہر اختلاف محمود ہے۔ بلکہ وہ اختلاف جو اصول اور دلائل واستنباطات سے مؤید ہو وہ ممدوح ہے اور وہ اختلاف جو ان حقائق سے دور ہو یا ایسے مسائل میں ہو جن میں اختلاف پیدا کرنے سے شریعت نے منع کر دیا ہے، ایسے اختلاف چاہے عوام کے ہوں یا علما کے مذموم ہیں۔(ص:۱۹۶)

۱۱۔اہلِ حق کے آپس کے اختلاف میں یہ بات کہنا کہ دونوں ایک نظریہ پر متفق ہو جائیں، عام مسلمانوں کو ملنے والی وسعت میں تنگی کا باعث بن جاتا ہے۔البتہ اگر دفعِ مضرات کا پہلو غالب ہو، تو اس کی کوشش کرنا چاہیے۔(ص:۱۱)

۱۲۔اہلِ حق میں اختلاف کی نوعیت (شدت وسنگینی) درپیش مسئلے کے ہم درجہ ہوتی ہے۔جس درجے کا معاملہ ہوگا، اسی درجے کی شدت ہوگی۔لہٰذا یہ نقص نہیں اور نہ شریعت کی خلاف ورزی ہے، بلکہ یہ مقتضائے عقل وایمان ہے۔(ص:۱۰)

تنازعات میں پسندیدہ طرزِ عمل

۱۳۔اختلاف کب نہیں ہوا؟ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا ہے، ہوتا رہے گا اور مخالفین و اختلاف ممدوح بھی ہوئے ہیں مذموم بھی۔ ہاں ہمارے لیے جو ضروری ہے وہ یہ کہ ان اختلافات کی نوعیت، اصولوں اور اختلاف کے وقت اس طرزِ عمل کو سیکھیں جو اختلاف کے وقت صحابہ رضی اللہ عنہم واکابرین کا تھا۔ان کا آپس کا اختلاف ان کے درمیان محبت، اخوت اور احترام کے ناتوں کو ہرگز ختم نہیں کرتا تھا، اور ہماری حالت یہ ہے کہ ذرا سے اختلاف پر اس قدر آگے چلے جاتے ہیں کہ مخالف سے محبت واحترام تو اپنی جگہ اُس کی ہر حق بات کو بھی ماننے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل تاریخ میں موجود ہے، اُس کا مطالعہ ہمیں کرنا چاہیے اور احوال کی اصلاح کرنا چاہیے۔(ص:۲۰۴)

۱۴۔اگر اہلِ حق کا آپس میں اختلاف ہو جائے اور وہ مسائل کے تدارک کے لیے دو راستے اختیار کرلیں اور دونوں راستوں میں نقصان واندیشہ ہو، تو اُن حضرات کی صوابدید پر کوئی ایک راستہ اختیار کرنا درست ہوگا۔(ص:۲۵)

۱۵۔ جب اہلِ حق کے درمیان اختلاف ہوتو دونوں گروہوں میں سے جس کے ساتھ عقیدت ہو، فکری ونظریاتی مناسبت ہو، اس کی اتباع کرنا چاہیے اور دوسرے گروہ پر زبان درازی سے گریز کرنا چاہیے۔ (ص:۵)

۱۶۔ جو لوگ علما پر اعتماد نہیں کرتے، وہ اپنے آپ کو مشکل میں ڈال رہے ہیں، کیوں کہ دینِ اسلام نقلی (قرآن وسنت پر مبنی) مذہب ہے، جس کے تمام تر اصول وفروع نقل سے آئے ہیں۔ اب انسان یا تو خود دین کا ضروری علم سیکھے یا علمائے کرام پر اعتماد کرتے ہوئے ہر بات میں ان سے پوچھ کر عمل کرے۔ جو ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں کرتا، تو انجام واضح ہے، کیوں کہ قانون کا نہ جاننا دنیا میں عذر نہیں، تو شریعت میں کیسے بن سکتا ہے۔ (ص:۱۷۷)

۱۷۔ اگر کوئی صاحبِ علم وفضل کسی ایسی بات کے خلاف بات کرے جسے ہم صحیح سمجھتے ہیں، تو ہمیں اس کی رائے کو تسلیم کرنا چاہیے اور اپنے موقف سے ہٹ جانا چاہیے۔ (ص:۲۱)

۱۸۔ مقلِّد کو اپنے مقتدیٰ کی تمام باتوں پہ عمل لازم ہے، لیکن اگر کسی سے شرعی منصوص کے خلاف بات صادر ہو، تو اس پر عمل کی گنجایش نہیں ہے۔ (ص:۲۳)

۱۹۔ خود پسندی اور اپنی رائے کو دوسرے کی رائے پر فوقیت دینا تکبر کے مظاہر میں سے ہے، اور اسے قیامت کی نشانی بتلایا گیا ہے: "إِعْجَابُ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ"۔ (ص:۲۲)

۲۰۔ کسی کے موقف پہ (تعمیری) تنقید کرنا ہو، تو سب سے پہلے اس کے دلائل کو پرکھ لینا چاہیے، ورنہ بڑی حماقت ہوگی۔ (ص:۲۱)

۲۱۔ کسی بھی عنوان پر کچھ بولنے اور لکھنے کے لیے اس کی تمام جزئیات کا ادراک واستحضار لازمی ہے۔ جب تک کسی چیز کے مالہ وما علیہ پر عبور نہ ہو، تو زبان وقلم کو رائے زنی سے روکے رکھنا چاہیے۔ (ص:۲۳)

۲۲۔ اگر مستنبط شدہ مسائل میں کسی سے اختلاف ہو، تو اس میں اپنے موقف پر شدت درست نہیں، کیوں کہ ایسے مسائل میں استنباط کا میدان وسیع ہے۔ (ص:۲۳)

۲۳۔ اگر مفتی کو معلوم ہو جائے (اور مفتی کو حالات معلوم کرنا بھی چاہییں) کہ مستفتی عمل کے لیے

فتویٰ نہیں لے رہا، بلکہ دنگے فساد کے ارادے سے لینا چاہتا ہے، تو اسے فتویٰ ہرگز نہ دینا چاہیے، تاکہ کسی کی وجہ سے انتشار پیدا نہ ہو۔ (ص: ۲۴)

۲۴۔ منصوص مسائل کے علاوہ وقت کے تقاضے کے پیش نظر پیدا ہونے والے مسائل کا حل اسلام اور مسلمانوں کی منفعت کے قاعدے کے تحت رہ کر نکالنا چاہیے۔ (ص: ۲۵)

۲۵۔ قواعدِ شرعیہ کے کسی ایک دو قواعد سے واقفیت سے اپنے آپ کو مسائل کے جواز وغیر جواز پہ جرأت نہیں دینا چاہیے، جب تک کہ تمام قواعد کا ادراک نہ ہو۔ (ص: ۲۵)

۲۶۔ اہلِ حق میں سے کسی ایک گروہ کے متعلق دل میلا کرنے سے بہت بڑے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ (ص: ٦)

۲۷۔ اگر ہم اہلِ حق میں سے کسی ایک گروہ کو صریح غلطی پر سمجھیں، تب بھی اس کے علمی کارناموں اور زہد وتقویٰ کے پیشِ نظر اس کے متعلق زبان درازی سے باز رہنا چاہیے۔ (ص: ۷)

۲۸۔ اگر کوئی صاحبِ فضیلت اپنے تقوی، اتباعِ سنت میں معروف ہے، لیکن اس سے کوئی ایک غلطی سرزد ہوگئی، تو فوراً طعن وتشنیع نہیں کرنا چاہیے، بلکہ توقف کرنا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ وہ رجوع کرلے۔ (ص: ۹)

۲۹۔ کسی کی کوئی بات پسند آنے پر مبالغہ آمیز تعریف کرنا، اس کو حقیقی مرتبے سے بڑھا دینا، یا کسی کی مخالفت میں شدت سے کام لے کر اسے حقیقی مرتبے سے گرا دینا یا گھٹا دینا، شریعت اور عقل دونوں کے منافی ہے۔ اس لیے تعریف اور مخالفت میں اعتدال برتنا چاہیے کہ یہی رویہ رکھنا اصل دانش مندی ہے۔ (ص: ۹)

۳۰۔ کسی کا عیب پوشیدہ رکھنے کا حکم عمومی ہے، لیکن مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کی خاطر کسی کا عیب یا برائی ظاہر کرنا ہو، تو صرف اتنا بولنا چاہیے جتنی شریعت نے اجازت دی ہے، بلاحق کسی کے متعلق زبان درازی وآبروریزی بدترین سود ہے۔ (ص: ۱۲۱)

۳۱۔ آج ہم اپنے سیاسی مخالف کو بلاثبوت، بلاتحقیق یا میڈیا کی کمزور اطلاعات کو ثبوت بناتے ہوئے زانی وشرابی تک کہنے سے باز نہیں آتے۔ یہ رویہ خطرناک ہے۔ (ص: ۱۲۱)

۳۲۔ حدیث میں ارشاد ہے کہ کبھی کبھی شیطان انسان کی شکل میں مجمع میں آ کے کوئی بات کہہ

دیتا ہے..... (الحدیث) اس حدیث کی روشنی میں ہمیں میڈیا کی حیثیت کا یقین آسان ہوجاتا ہے۔ ہم میڈیا ذرائع کی کمزور اطلاعات کو ثبوت بنا کر سیاسی مخالفت میں آخری حد تک چلے جاتے ہیں۔

۳۳۔سیاسی مخالفت میں کسی سے الگ نظریہ اور الگ طرزِ عمل اختیار کرنا الگ بات ہے، اس میں قباحت نہیں، لیکن سیاسی مخالفت کی آڑ میں جماعتی حسد کی بھڑاس نکالنے یا الزام لگانے کے لیے شرعی ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے، اِس کے بغیر الزام تراشی بہت بڑا جرم ہے۔(ص:۱۲۲)

۳۴۔دوسروں کے عیب تلاش کرنے اور انہیں پھیلانے سے بہتر ہے کہ ہمیں اپنے عیوب کی تلاش اور ان کی اصلاح کی فکر دامن گیر ہو، تا کہ اس کے بعد ہمیں دوسروں کے عیوب دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملے۔(ص:۱۲۴)

۳۵۔زبان کی حفاظت نہایت ضروری ہے، کیوں کہ زبان کا غلط استعمال انسان کو دنیا میں اور آخرت میں رسوا کر دینے والا عمل ہے، لیکن جہاں ہم دین کے دوسرے معاملات میں بے اعتنا ہیں، زبان کے معاملے میں بھی ہمارا برا حال ہے۔ ذرا سی مخالفت میں معاملہ کفر و نفاق اور حق و باطل تک پہنچا دیتے ہیں، اور اپنے مخالف پہ بڑے سے بڑا الزام اور فتوے لگانے سے بھی نہیں جھجکتے۔(ص:۱۲۴)

۳۶۔کسی کو خود غرض یا حبِ جاہ و مال کا ملزم قرار دینا درست نہیں، اس لیے کہ اب ہمارے لیے وحی نہیں آتی، جس سے معلوم ہو کہ کون سا راستہ حق ہے۔ راستی متعین نہ ہونے کے باعث جو راستہ ہمارے مخالف کو مناسب و ضروری معلوم ہوا اس نے وہ اختیار کرلیا۔ اگر راستہ متعین ہو، تب بھی یہ الزام درست نہیں، کیوں کہ ضروری نہیں کہ اُس نے خود غرضی کی بنا پر یہ راستہ اختیار کیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اجتہادی خطا ہو، تو اس لیے ضروری ہے کہ اسے سمجھاؤ اور مسلمانوں والے اخلاق کے ذریعے اپنا ہم نوا بناؤ، نہ کہ جھوٹے عیوب اُس پر چسپاں کرتے چلے جاؤ، کیوں کہ بلا ثبوت بات کہنا تو گناہ ہے ہی، سوچنا بھی ظلم ہے۔(ص:۱۲۵)

۳۷۔جہاں اغراض و مقاصد کے لیے کام کرنا خطرناک ہے، وہیں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ ہر شخص کو صاحبِ غرض سمجھنا یہ بھی نہایت خطرناک عمل ہے۔ کسی کے متعلق رائے قائم کرنا

اس کے احوال کی تحقیق کے بغیر ناممکن ہے اور درست نہیں، کیوں کہ بدگمانی بہت بڑا گناہ ہے۔ پھر ایسے شخص پر جو اللہ کے لیے کام کرتا ہو، اُس کی نیک نیتی پہ شک کر کے اُسے مشکوک بنانا، جس سے اس کے کام میں رکاوٹ آئے اور بھی خطرے کی بات ہے۔ (ص: ۱۱۷)

۳۸۔ ہماری حالت یہ ہے کہ جو شخص ہماری رائے کے موافق عمل کرے گا، ہم اس کے ہزاروں عیوب کے باوجود اس کا دفاع کریں گے اور اس کی مخلصی کا اعلان کریں گے، لیکن جوں ہی اس نے ہماری رائے سے الگ رائے قائم کی، ہم اسے خودغرض، چور، انگریز کا غلام غرض اس میں موجود عیوب کے ساتھ مزید مفروضوں کا اضافہ کر کے اُس کی شخصیت کو داغدار بنادیں گے۔ عمومی حالات اور بالخصوص سیاسی میدان میں یہ برائی خطرناک حد تک پھیل چکی ہے کہ اپنے سیاسی حریف کا سیاسی کیریئر تباہ کرنے کے لیے ہزاروں بلاتحقیق الزامات لگا کر اپنی آخرت تباہ کی جارہی ہے۔ (ص: ۱۱۷)

۳۹۔ اہلِ حق کے درمیان تقابل کا حق ہر کس و ناکس کو ہرگز حاصل نہیں ہے، بلکہ جن میں تین شرائط ہوں وہ جائیں اور دونوں طرف کے حضرات کی طویل گفتگو سنیں اور فیصلہ کریں۔ پہلی: پکے (جہاں دیدہ) لوگ ہوں اور حالات سے خوب واقف ہوں۔ دوسری: صاحبِ علم وعمل اور ذوقِ سلیم کے مالک ہوں۔ تیسری: متحمل مزاج ہوں۔ (ص: ۱۲)

اسلامک اسکولز میں فراموش کردہ پہلو ❶

سید شرف الدین احمد
ماہر تعلیم/ استاذ تخصص فی العقیدۃ والفکر الاسلامی

یہ مضمون ان تعلیمی اداروں کی ستایش میں لکھا جارہا ہے جنھوں نے اخلاص کے ساتھ مسلمان بچوں کو اسلامی اور دینی ماحول میں دنیاوی تعلیم دینے کا بیڑا اٹھایا اور معاشرے کے رخ کو درست سمت میں گامزن کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

اسلامک اسکولز کی ابتدا:

اگر آپ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں کراچی کا جائزہ لیں، تو آپ کو یاد ہوگا کہ اس زمانے میں شہر کی مساجد کو رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے والوں کی کافی کمی کا سامنا تھا اور حافظِ قرآن ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے۔ پھر اقرا روضۃ الاطفال نام کا ایک اسلامک اسکول کراچی میں قائم ہوا اور اپنے بچوں کو اسکول کی تعلیم کے ساتھ حفظ کرانے کے لیے شہریوں نے جوق در جوق اس بے مثال تعلیمی ادارے کا رخ کیا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ آج آپ رمضان المبارک میں کسی بھی مسجد میں چلے جائیں، آپ کو کئی حفاظ ایک ہی احاطے میں جگہ جگہ تراویح پڑھاتے ملیں گے، جب کہ بے شمار گھروں سے بھی قرآنِ کریم کی تلاوت کی میٹھی اور دل رُبا آواز بلند ہوتی سنائی دے گی۔ اقرا روضۃ الاطفال کے بعد الحمدللہ ایسے اسکولوں کا کراچی اور پھر پورے پاکستان میں رواج پڑتا چلا گیا، اور نخلہ اسکول، البدر اسکول، صفہ سیوئیر، الیقین ماڈل اسکول اور حفاظ ایکسکلوسو اکیڈمی قائم ہوئے۔ ان اسکولوں کے بچوں نے الحمد للہ نا صرف حفظ نہایت پختگی کے ساتھ مکمل کیا، بلکہ سرکاری بورڈز میں نمایاں کامیابیاں یہاں تک کہ پوزیشنیں بھی حاصل کیں۔

عملی زندگی میں کامیابی :

ان اسلامک اسکولز کے بچے تعلیم حاصل کرنے کے بعد جس بھی دنیاوی شعبے میں گئے، کامیابیوں نے ان کے قدم چومے۔ وہ ڈاکٹر، انجینئر، صنعت کار، استاذ اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن کر معاشرے کی خدمت کر رہے ہیں۔ اسی طرح ان بچوں کی ایک بڑی تعداد نے دینی مدارس کا رخ کیا اور عالم بن کر دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

کیا فراموش کر دیا گیا؟

اسلامک اسکول اس نظریے کے تحت قائم کیے گئے تھے کہ مسلمان بچوں کو دینی ماحول میں دنیاوی تعلیم دی جائے، تاکہ ان کے ایمان وعمل کی حفاظت کی جاسکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دینی سوچ وکردار کے اساتذہ اور معلمات کا انتخاب کیا گیا۔ ایسی نصابی کتب رکھی گئیں، جو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوں اور ان میں کسی قسم کا غیر اسلامی مواد نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے بعض اسلامک اسکولز نے اپنا نصاب خود مرتب کیا، تاکہ انہیں دوسرے پبلشرز پر انحصار نہ کرنا پڑے۔

اسلامک اسکولز نے ہفتہ واری یا ماہانہ تربیتی واصلاحی بیانات کا سلسلہ بھی شروع کیا، جو اب بھی الحمدللہ جاری ہے، جن کے لیے جید علمائے کرام اور اہلِ دین کو مدعو کیا جاتا ہے، تاکہ ایک طرف بچوں کی دینی تربیت کی جاسکے، اور دوسری طرف اساتذہ اور معلمات کی بھی ذہن سازی ہو۔

> اسلامک اسکولز کے طلبہ بھی عام اسکولوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طرح شکوک وشبہات کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں، جہاں ان کا کوئی حامی وناصر یا مددگار نہیں ہوتا۔ اگر وہ اہلِ علم کے سامنے اپنے دل کا حال بیان کریں، تو راندۂ درگاہ قرار پائیں۔ خود سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کریں تو اور الجھ جائیں۔ اسی کشمکش میں وہ آہستہ آہستہ اپنی راہ سے بیگانے ہوتے جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

ان تمام اچھائیوں کے باوجود اسلامک اسکول دینی تربیت کے ایک نہایت نازک اور اہم پہلو سے صرفِ نظر کیے ہوئے ہیں، جس پر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ اس پہلو کو فراموش کرنے کی وجہ سے بچوں کی اعتقادی اور فکری تربیت میں کمی رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا، تو انہیں لادین نظریات کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اس کا مناسب طریقے سے مقابلہ نہیں کرسکے۔ اگرچہ اسلامک اسکولز کو اس حوالے سے آگہی تھی، لیکن اس بارے میں زیادہ غور وغوض نہ ہونے اور محدود وقت میں نصاب (syllabus) مکمل کرانے اور متعلقہ ایجوکیشنل بورڈ کے امتحانات کی تیاری کی فکر میں طلبہ کی ذہنی اور فکری تربیت کما حقہ نہیں ہوسکی۔

اسکولوں خاص طور پر اسلامک اسکولز کے بچے جب ہائیر ایجوکیشن کی طرف گئے، پاکستان ہی کے کالجوں یا یونیورسٹیوں میں داخل ہوئے، انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ اور امریکا کا رخ کیا، سوشل میڈیا جیسے فیس بک، یوٹیوب اور دیگر چینلز سے جڑے یا عام کاروباری اور دفتری ماحول کا حصہ بنے، جہاں ہر طرح کے مثبت ومنفی خیالات کے حامل افراد سے واسطہ پڑا اور ان سے پیشہ ورانہ معاملات کے ساتھ ساتھ باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلہ خیال کا موقع ملا، تو انہیں ایک انتہائی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا:

اسلامک اسکولز سے پڑھے ہوئے نوجوانوں میں بلاشبہہ دین کے لیے کچھ کر دکھانے کا عزم موجود ہوتا ہے اور جہاں کہیں کوئی دینی ضرورت پیش آتی ہے، وہ اس کے لیے محنت اور کوشش میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ایسے مواقع پر اسکول میں دورانِ تعلیم اساتذہ اور معلمات سے سنی ہوئی دینی تربیتی باتیں (Islamic Motivational Speech or Talks) ان کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہیں۔ اسکول میں وقتاً فوقتاً تشریف لانے والے مہمان علمائے کرام اور مبلغین کی تقاریر سے بھی ان کا بہت اچھا دینی ذہن بن چکا ہوتا ہے اور وہ خود کو دورِ حاضر کے فتنوں سے بچانے کی فکر کرتے ہیں، مگر.....

لیکن ان میں سے بعض کو پیشہ ورانہ زندگی یا نئی دنیا میں بہت سے ایسے گھاگ اور چالاک

لوگوں سے پالا پڑ جاتا ہے، جو ضروریاتِ دین یعنی عقائدِ اسلام سے متعلق دل میں شکوک وشبہات کے بیج بونے میں ماہر اور اس حوالے سے باقاعدہ تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ دراصل ان کا کام ہی معصوم مسلمان اذہان میں تحقیق کے نام پر شکوک وشبہات کے بیج بونا ہوتا ہے، جو اندر ہی اندر نشوو نما پا کر کچھ عرصے بعد خاردار جھاڑیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پھر ہمارے یہ نوجوان ان کے زیرِ اثر دینِ اسلام اور اس کے مسلّمہ عقائد سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ امورِ آخرت یعنی بعث، نشور، حساب، جنت اور دوزخ ان کے لیے خام خیال یا کم از کم دھندلے تصورات بن جاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں فروزاں شمعِ توحید و رسالت کی لو مدھم پڑنے لگتی ہے اور زمانے کی تلاطم خیز موجیں اسے بالکل ہی بجھا دیتی ہیں۔ جب شکوک وشبہات کے بیج بونے والے اپنے کام میں ماہر وگھاگ ہوں اور نئے نئے فارغ التحصیل نوجوانوں کا ان سے واسطہ پڑ جائے، جو ابھی ابھی میدانِ عمل میں وارد ہوئے ہوں، تو طلسمِ سامری اپنا اثر دکھاتا ہے اور برسوں سے دلوں میں راسخ عقائد کو بھی متزلزل کر دیتا ہے۔

> شکوک و شبہات کے بیج بونے والے اپنے کام میں ماہر وگھاگ ہوں اور نئے نئے فارغ التحصیل نوجوانوں کا ان سے واسطہ پڑجائے، جو ابھی ابھی میدانِ عمل میں وارد ہوئے ہوں، تو طلسمِ سامری اپنا اثر دکھاتا ہے اور برسوں سے دلوں میں راسخ عقائد کو بھی متزلزل کر دیتا ہے۔

غرض اسلامک اسکولز سے نکلنے والے طلبہ بھی عام اسکولوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طرح شکوک وشبہات کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں، جہاں ان کا کوئی حامی و ناصر یا مددگار نہیں ہوتا۔ اگر وہ اہلِ علم کے سامنے اپنے دل کا حال بیان کریں، تو راندۂ درگاہ ٹھہریں۔ خود سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کریں تو اور الجھ جائیں۔ اسی کشمکش میں پڑ کر آہستہ آہستہ اپنی راہ سے بیگانے ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس بیگانگی کی خبر نہ ان کے گھر والوں کو ہو پاتی ہے نہ ان اسلامک اسکولز کے منتظمین کو جو فی زمانہ خود کو زیادہ سے زیادہ منافع سازی (Commercialism) کے جال میں الجھائے بیٹھے ہیں، اور رفتہ رفتہ ان کا مقصد دین کے نام پر عمارتوں پر عمارتیں کھڑی کرنے یا اپنے ادارے یا ذات کے لیے مال و دولت میں اضافے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

قصور کس کا ہے؟

بظاہر اس سوال کا جواب دینے کی حاجت نہیں، بلکہ سر سے اتنا پانی گزر چکا ہے کہ اب یہ سوال اتنا قابلِ اعتنا رہا بھی نہیں ہے۔ اس کے بجائے اس وقت توجہ کے لائق وہ درست لائحہ عمل معلوم کرنا اور اس پر گامزن ہونا ہے، جس کے ذریعے نا صرف ہمارے اسلامک اسکولز میں زیرِ تعلیم طلبہ کی حفاظت ہو سکے، بلکہ عصری تعلیم گاہوں میں موجود نوجوانوں کو بھی عقیدے اور فکر کے اس عجیب گرداب سے نکالا جا سکے، تاہم ان حفاظتی اقدامات کے اجرا سے قبل ہماری اپنی سوچ (Approach) کا درست ہونا انتہائی ضروری ہے۔ عام طور سے ہم سب Reactive Approach والے ہیں، یعنی اس وقت ہوشیار ہوتے ہیں، جب خطرہ سر پر آ پہنچے، جب کہ Proactive Approach یعنی پیشگی منصوبہ بندی سے اکثر اوقات ہم سب غفلت برتتے ہیں اور اس کا خمیازہ ہمیں اجتماعی طور پر بھگتنا پڑتا ہے۔ تاہم یہ معاملہ اپنی حساسیت اور ہماری آیندہ نسلوں کی دینی بقا کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اس لیے اس پر آج ہی توجہ دینا ضروری ہے۔ اسلامک اسکولز کے لیے ماضی وحال کی آمیزش سے مستقبل کی نئی راہیں متعین کرنا وقت کا تقاضہ ہے، جن پر ان شاء اللہ آیندہ نشست میں گفتگو ہوگی۔

جاری ہے.....

تاریخ .... عبرت کدۂ ماضی پاسبانِ مستقبل ❶

منیب حسین
استاذ تخصص فی العقیدۃ والفکر الاسلامی

کائنات میں ہر لمحہ تغیر وتبدل کا عمل کار فرما ہے۔ ہر شے ایک حالت سے دوسری میں منتقل ہو رہی ہے۔ عدم سے وجود اور بقا سے فنا کا یہ سفر مبدا یعنی تخلیقِ خلق کی ابتدا سے جاری ساری ہے۔ اسی سفر کا نام وقت ہے، جو کبھی تھمتا نہیں۔ ایک ہی رفتار پر چلے جا رہا ہے۔ بڑے سے بڑا حادثہ اسے روک نہیں سکتا۔ اس وقت کا جو حصہ گزر گیا، اسے ماضی کہتے ہیں اور اس میں رونما ہونے والے حادثات وواقعات تاریخ کہلاتے ہیں، جو عبرت پکڑنے والوں کو مستقبل سازی کے لیے کلید اور مشعل کا کام دیتے ہیں۔ تاریخ ایک سماجی علم ہے۔ یہ اتنا ہی قدیم ہے، جتنا خود حضرتِ انسان پرانے ہیں۔

دیگر مذاہب کی آسمانی کتب اور اسلامی عہد میں تاریخ پر کی گئیں تصنیفات کو اٹھا لیجیے، ان کا آغاز ابتدائے تخلیق کی بحث سے ہوتا ہے اور عرش وکرسی کو وجود بخشنے سے آدم علیہ السلام کا خمیر گوندھنے تک پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ خود قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿قُلۡ اَئِنَّكُمۡ لَتَكۡفُرُوۡنَ بِالَّذِىۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ وَتَجۡعَلُوۡنَ لَهٗۤ اَنۡدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۞ وَجَعَلَ فِيۡهَا رَوَاسِىَ مِنۡ فَوۡقِهَا وَبٰرَكَ فِيۡهَا وَقَدَّرَ فِيۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا فِىۡۤ اَرۡبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيۡنَ ۞ ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلۡاَرۡضِ ائۡتِيَا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيۡنَا طَآئِعِيۡنَ ۞ فَقَضٰٮهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوَاتٍ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ وَاَوۡحٰى فِىۡ كُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا ؕ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ ۖ وَحِفۡظًا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ۞﴾ (فصلت: ۹-۱۲)

کہو: کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا اور (بتوں کو) اس کا مدمقابل بناتے ہو۔ وہی تو سارے جہان کا مالک ہے۔ اور اسی

نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سب سامانِ معیشت مقرر کیا (سب) چار دن میں، (اور تمام) طلبگاروں کے لیے یکساں۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا، تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ (خواہ) خوشی سے خواہ ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں۔ پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس (کے کام) کا حکم بھیجا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے مزین کیا اور (شیطانوں سے) محفوظ رکھا۔ یہ زبردست (اور) خبردار کے (مقرر کیے ہوئے) انداز ے ہیں۔

ان آیات میں بھی بدأ الخلق یعنی تخلیق کی ابتدا کا تذکرہ ہے۔ زمین و آسمان کو پیدا کیے جانے کی تقویم بیان کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے:

ایک بار نبی کریم ﷺ کے پاس یہود آئے اور انہوں نے آسمان و زمین کی تخلیق سے متعلق سوال کیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین کو اتوار اور پیر کے روز پیدا کیا، منگل کے روز پہاڑ اور ان کے منافع پیدا کیے، بدھ کے روز درخت، پانی، شہر، آبادیاں اور ویرانے تخلیق کیے۔ یہ کل چار دن ہوئے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ۝﴾ پھر فرمایا: اور جمعرات کے روز آسمان کو پیدا کیا، جب کہ جمعہ کے روز آخر کی تین گھڑیاں چھوڑ کر ستارے، سورج، چاند اور فرشتوں کو وجود بخشا۔ آخری تین گھڑیوں میں سے پہلی میں زندگی اور موت کے اوقات تخلیق کیے، دوسری میں ہر شے میں آفت ڈالی، جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، اور آخری گھڑی میں حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ السلام کو پیدا کر کے جنت میں بسایا اور شیطان کو انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ (تاریخ الطبری)

ان آیات میں صراحتاً اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بیان ہے، جب کہ اشارۃً انسان کو اپنے کاموں کو بہ تدریج کرنے کی ترغیب ہے۔ ساتھ ہی بیانیہ تاریخی ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں انبیائے کرام علیہم السلام اور سابق اقوام کے واقعات بہ کثرت موجود ہیں، جن کا مقصد رہنمائی اور سامانِ عبرت پیش کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (ھود:۱۲۰)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور پیغمبروں کے وہ سب حالات جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں، ان سے ہم تمہارے دل کو قائم رکھتے ہیں، اور ان (قصص) میں تمہارے پاس حق پہنچ گیا، اور یہ مؤمنوں کے لیے نصیحت اور عبرت ہے۔

ایک اور آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ (محمد:۳۸)

کیا ان لوگوں نے زمین میں سیر نہیں کی، تاکہ دیکھتے جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیسا ہوا۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اپنا حال سنوارنے کے لیے ماضی کے دریچوں میں جھانکنا ضروری ہے۔ نیز یہ بھی اشارہ ملا کہ تاریخ ایک فکری علم ہے، محض قصہ خوانی یا دستاویز کاری نہیں۔ ہم مسلمانوں کو تو دوسروں سے زیادہ اس کا تفصیلی، تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے نائب کی حیثیت سے ہمیں دنیا کی حاکمیت کے لیے منتخب کیا ہے۔ جن حالات سے بہ حیثیت اُمت آج ہم گزر رہے ہیں، ان سے نکلنے کے لیے قرآن وسنت کے حقیقی فہم کے ساتھ تاریخ سے آگاہی بھی نہایت ضروری ہے، کیوں کہ یہ ہمیں ماضی کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم تاریخ پڑھیں، سمجھیں اور اپنا رخ متعین کریں، لیکن سوال یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟

علم التاریخ:

مطالعۂ تاریخ سے قبل علم التاریخ اور اس کے مبادی کو سمجھنا ضروری ہے، جو تاریخ نویسی یا تاریخ خوانی کا مقدمہ ہیں۔ تاریخ گزرے ہوئے ماہ وسال، سلطنتوں و بادشاہوں اور اقوام وتہذیبوں کے حالات بیان کرنے کا نام ہے، جب کہ علم التاریخ وقت کا تعین کرتے ہوئے ماضی کے حالات، واقعات ومتعلقات کی جستجو اور ان پر بحث کرنے کا نام ہے۔ (المختصر فی علم التاریخ للکافیجی، عالم الکتب، ۱۴۱۰ء، ص: ۱۶) امام سخاوی فرماتے ہیں: یہ ایسا فن ہے، جس میں واقعاتِ زمانہ پر ان کی تعیین اور وقت کی حیثیت سے بحث کی جاتی ہے۔ (الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ للسخاوی، مؤسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۴۰۷ھ، ص: ۱۹) یہی وجہ ہے کہ مسلمان مؤرخین نے وقائع نگاری میں ماہ وسال کے تعین کی شرط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی کتب کو سن وار ترتیب دیا ہے۔

ابنِ خلدون کے نزدیک یہ علم اپنے ظاہر میں صرف اتنا ہے کہ واقعات، حکومتوں اور گزشتہ صدیوں کی خبر دی جائے، تاہم اپنے باطن یعنی حقیقت میں تحقیق ونظر کا حامل ہے۔ ابنِ خلدون کے مطابق چوں کہ اس کا ظاہر قصہ گوئی ہے، اس لیے اسے سمجھنے میں عالم وجاہل سب برابر ہیں۔ (المقدمہ لابن خلدون، داریعرب دمشق، ۱۴۲۵ھ، ص: ۸۱) تاہم نامور مسلمان مؤرخین نے تاریخی واقعات کو جمع کر کے ایسی کتب لکھ دی ہیں، جن کے باعث تاریخ ایک فن یا علم کی صورت اختیار کر گئی ہے اور یہ تصانیف فہمِ تاریخ میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

اس علم کا موضوع زمانہ اور انسان ہے، اور اس میں ان دونوں کے عارضی احوال پر تفصیلی بحث کی جاتی ہے۔ (الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ، ص: ۱۹) تاہم کافیجی نے اس کا موضوع غیر معمولی واقعات سے متعلق امور کو قرار دے کر خاص کر دیا ہے۔ (المختصر، ص: ۶۵)

یہ انتہائی عظیم الشان علم ہے، کیوں کہ یہ انسان کو ماضی کے احتساب اور مستقبل کی منصوبہ بندی کی راہ دکھاتا ہے۔ ناکامیوں کا تجزیہ کرنے اور آیندہ ان سے بچنے کا سبق دیتا ہے۔ کامیابیوں کا تسلسل برقرار رکھنے میں مددگار رہتا ہے۔ اس سے متعلق ابنِ خلدون لکھتے ہیں:

یہ علم مستحکم خطوط، کثیر فوائد اور بلند مقاصد پر مشتمل ہے، کیوں کہ یہ ہمیں ماضی کی مختلف اقوام کے حالات، انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں اور بادشاہوں کی سلطنتوں وطرزِ

سیاست سے آگاہ کرتا ہے، تاکہ بعد میں آنے والا وہ شخص اس سے مکمل استفادہ کر سکے، جو دین و دنیا کے معاملات میں اس جانب دیکھتا ہے۔ (المقدمہ، ۹۲)

تاریخ پڑھنے سے اپنے اسلاف اور آبا واجداد سے تعلق مضبوط ہوتا ہے، اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا حوصلہ ورہنمائی ملتی ہے۔ انسان اپنی تہذیب وتمدن سے واقف رہتا ہے اور اغیار کے بود وباش یا ان کے سماج کی ظاہری چکا چوند سے مغلوب نہیں ہوتا۔ ماضی کے عقائد، افکار اور نظریات سے آگاہی ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں انسان اعتقادی وفکری انحراف سے بچ سکتا ہے۔ واقعات سے عبرت ملتی ہے اور انسان کے لیے خود کو دینی و دنیاوی خسارے سے محفوظ رکھنے کی سعی کرنا ممکن ہوتا ہے۔ خود احتسابی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو تلافی مافات اور مستقبل سازی پر مجبور کرتا ہے۔ اس سے انسان کو ماضی کی کامیابیوں کا تسلسل برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے اور دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ممکن ہوتا ہے۔

تدوینِ تاریخ:

انسان نے سب سے پہلے اپنے حافظے میں تاریخ کو محفوظ کیا۔ پھر اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات میں سے اہم واقعات کو آیندہ آنے والوں تک زبانی منتقل کرنا شروع کیا۔

پھر وہ نقش کی مدد سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنے لگا، تو تاریخ کو بھی نقوش کی صورت میں نقل کرنا شروع کر دیا۔ یہ منقش تاریخ آج بھی دنیا کے چپے چپے میں چٹانوں اور دیواروں پر کندہ ہے، اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

ابتدا میں انسان نے اپنے جھوٹے معبودوں کی گھڑی ہوئی داستانوں کو تاریخ کا موضوع بنایا، پھر اس میں اپنے نامور سپوتوں کا تذکرہ شامل کر لیا۔ یوں بتوں کے ساتھ ان سپوتوں کے کارناموں کو بھی تاریخی مواد میں جگہ دی جانے لگی۔

قرونِ وسطیٰ میں یونان سے تاریخ نویسی کی نئی قسم ابھری، جسے یونانی تقلیدی تاریخ کہا جاتا ہے، جو مقدس شخصیات کی تاریخ سے معروف ہے۔ مکتبِ ہومر Homer نے تاریخ کی داستانی شکل کو بدل کر رکھ دیا اور اسی مکتب سے ہیروڈوٹس یا ہیرودوت Herodotus جیسا مؤرخ پیدا

ہوا، جسے ابوالتاریخ کہا جاتا ہے۔اس کا زمانہ ۴۲۵ قبل مسیح ہے۔اس نے تاریخ میں دو اسلوب متعارف کرائے۔ ایک عقلی، جس میں واقعات کو حقیقی پیرائے میں محفوظ کیا گیا، جب کہ دوسرا عالمی، جس کا مقصد اپنے ساتھ دیگر اقوام کی تاریخ بھی محفوظ کرنا تھا۔

ہیروڈوٹس سیاح تھا۔اس نے مختلف جنگوں کا خود مشاہدہ کیا، اور عراق، مصر اور فینیقی خطے کی سیاحت کی اور وہاں کی شخصیات کے حالات کے ساتھ اپنے نئے منہج کے مطابق تاریخ لکھی۔اس نے داستان نویسی کو ترک کر کے واقعاتی تاریخ لکھی۔اس کی کتاب ''استوریا'' تاریخ کی قدیم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔یہ نو کتابوں کا مجموعہ ہے۔

اسی مکتب سے بعد میں تھوسی ڈائڈز Thucydides آیا، جن نے ایک جامع تاریخ قلم بند کی، جس میں ایتھنز اور اسپارٹا کی اٹھائیس سالہ جنگ کے مفصل حالات تحریر کیے۔ اس بنا پر اسے بابائے علم التاریخ the father of scientific history کہا جاتا ہے۔اس کے بعد پولیبیوس Polybius آیا۔اس نے بھی جنگوں کی تاریخ لکھی۔

یونانیوں کے بعد رومیوں نے اس میدان میں قدم رکھا۔انہوں نے ہی سب سے پہلے تاریخی دستاویز کو محفوظ کرنے کا عمل شروع کیا اور اسے مذہبی اداروں کے سپرد کر کے ''کلیات'' کا نام دیا۔یوں ان کے ہاں تاریخ نویسی ریاستی امور میں شمار ہوئی۔

رومیوں میں جولیس سیزر Julius Caesar کو اپنے دور کا پہلا مؤرخ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک جنرل اور اشرافیہ میں سے تھا۔اس نے کئی کتابیں لکھیں۔ سات کتابوں پر مشتمل The Gallic Wars اس کی مشہور کتاب ہے، جس میں اس نے گال اور جنوبی برطانیہ میں اپنی پیش قدمی کے سات برسوں کی داستان لکھی ہے۔ اس کی دوسری کتاب The Civil War ہے۔اس کے بعد ورجل آیا، جو شاعر تھا۔اس نے روم کی تاریخ لکھی۔

علم التاریخ کو عروج مسلمانوں کے ہاتھوں ملا۔ بعثِ نبوی کے وقت عربوں میں پڑھنے لکھنے کا کچھ زیادہ رواج نہ تھا، اسی بنا پر قرآنِ کریم نے انہیں ''اُمی'' قرار دیا: ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا﴾ (جمعه: ۲)۔یہی وجہ ہے کہ عربوں میں تاریخ لکھنے کا بھی رواج نہیں تھا۔وہ شعر وشاعری کی طرح اس میدان میں بھی اپنے حافظے پر اعتماد کرتے تھے، اور تاریخ کو اپنی

جنگوں اور باہمی تنازعات یا اسبابِ تفاخر جیسے حسب نسب تک ہی محدود رکھتے تھے۔اس میں بھی ان کی کوشش ہوتی کہ اسے قصائد کی صورت میں محفوظ کرلیں۔نیز ان کے ہاں تاریخ بیانی کی حیثیت قصہ گوئی سے زیادہ نہیں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب جناب رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا،عربوں کو اپنی زبان میں پہلی کتاب یعنی قرآنِ کریم میسر آئی اور اس نورِ ہدایت نے ان کے باطن کی آنکھ کھولنے کے ساتھ ان کی فکر کے دریچے بھی وا کیے۔یوں انہوں نے تاریخ سمیت علم و تحقیق کے ہر میدان میں مختلف جہات سے سوچنا اور پڑھنا لکھنا شروع کیا۔مسلمانوں نے اس ضمن میں سب سے پہلے ''سیرتِ طیبہ'' پر توجہ دی،کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو ہمارے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے:﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (احزاب:۲۱)۔سیرت نگاری میں بھی سب سے پہلے مغازی پر توجہ دی گئی۔

اس کے بعد ''انساب'' کو موضوعِ تالیف بنایا گیا،کیوں کہ بہت سے شرعی احکام جیسے امارت،میراث اور دیت وغیرہ میں اس کی ضرورت تھی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو دواوین مرتب کرائے،ان میں بھی سبقت الی الاسلام کے بعد نسب ہی کا لحاظ رکھا گیا۔پھر مسلمان مؤرخین نے ''فتوح البلدان'' پر قلم اٹھایا۔اس میں بھی دینی عنصر موجود تھا،کیوں کہ مفتوح علاقوں کے احکام شریعتِ مطہرہ میں مختلف ہیں۔بہ زورِ طاقت لیے گئے خطوں سے متعلق فقہی جزئیات الگ ہیں اور صلح سے حاصل کردہ اراضی کی جدا۔انہیں کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کون سی اقوام معاہد تھیں اور کون سی اہلِ ذمہ۔کون سی جزیہ دیتی تھی اور کن سے خراج لیا جاتا تھا۔

روایتِ حدیث میں جھوٹ اور آمیزش سے کام لیا جانے لگا،تو تاریخ کی نئی شاخ ''فنِ اسماء الرجال'' وجود میں آیا،تاکہ مقبول و مردود روایات میں تمیز کرکے قابلِ قبول پر عمل کرنا ممکن ہو۔اسی طرح فرقِ باطلہ کا ظہور ہوا اور انہوں نے اعتقادی و سیاسی میدانوں میں مسلمانوں کو زچ کرنے کی ناکام کوششیں کیں،تو مسلمانوں نے ان دونوں جہات سے بھی تاریخ کو مدوّن کرنا شروع کیا،تاکہ آیندہ نسلوں تک حقائق پہنچ سکیں۔

تاریخ میں مسلمانوں کی اوّلین باضابطہ کتب ''الملوک واخبار الماضین'' اور ''التیجان فی

ملوک حمیر'' ہیں۔ اوّل الذکر پہلی صدی ہجری کے مؤرخ عبید بن شریہ (متوفی ۶۷ ھ) کی ہے، جو انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم پر املا کرائی، جب کہ دوسری وہب بن منبہ (متوفی ۱۱۳ھ) کی تالیف ہے۔ اس لیے مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ مسلمانوں کی تاریخ ڈیڑھ صدی تک زبانی کلامی منتقل ہوتی رہی، درست نہیں ہے۔ ان کا یہ اعتراض کم علمی یا عناد پر مبنی ہے۔ دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں نے تاریخ نویسی کا عمل تیز کیا۔ بظاہر مستشرقین نے اسی کو بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کیا۔ دوسری صدی ہجری کی تالیفات میں محمد بن سائب الکلبی (متوفی ۱۴۶ھ) کی ''الانساب والاخبار''، عوانہ بن الحکم (متوفی ۱۴۷ ھ) کی ''التاریخ'' اور ''سیرتِ معاویہؓ وبنی اُمیہ''، محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۱ھ) کی ''السیرہ النبویہ'' اور ابومخنف لوط بن یحییٰ ازدی (متوفی ۱۵۷ ھ) کی ''الفتوح والردۃ''، ''الجمل''، ''الصفین''، ''النہروان''، ''مقتل علی'' و ''مقتل الحسین'' سمیت تیس سے زائد کتب شامل ہیں۔

ان کے بعد تیسری صدی ہجری میں وفات پانے والے مؤرخین کی ایک بڑی تعداد ہے، جنہوں نے تاریخ کے موضوع پر باضابطہ قلم اٹھایا۔ ان میں ہشام بن محمد بن سائب الکلبی (متوفی ۲۰۶ھ)، ہیثم بن عدی (متوفی ۲۰۷ھ)، محمد بن عمر الواقدی (متوفی ۲۰۷ھ)، ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ (متوفی ۲۱۰ھ)، نصر بن مزاحم منقری (متوفی ۲۱۳ھ) اور ابوالحسن علی بن محمد المدائنی (متوفی ۲۲۴ھ) سرفہرست ہیں۔

یہ تصنیفات مختصر رسالوں یا مخصوص موضوعات پر مشتمل اور جامعیت سے خالی تھیں۔ کتبِ تاریخ کی اس کمزوری کو پورا کرنے کے لیے محمد بن سعد، خلیفہ بن خیاط، ابوحنیفہ دینوری، یعقوبی اور محمد بن جریر الطبری جیسے حضرات میدان میں آئے، اور انہوں نے جامع تواریخ لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، اور بعد میں آنے والوں جیسے ابن الاثیر، ابن الجوزی، ابنِ خلدون، ابنِ کثیر اور ذہبی نے اسے بامِ عروج پر پہنچایا۔

جاری ہے.....

نفس کی حقیقت

مولانا ثاقب محمود
شریک تخصص فی العقیدۃ والفکر الاسلامی

انسان اللہ تعالیٰ کی جامع ترین مخلوق ہے۔ اس میں وہ تمام عناصر اور صفات موجود ہیں، جو کائنات میں پائی جاتی ہیں۔ اسی لیے صوفیہ نے اسے ''عالمِ صغیر'' کہا ہے کہ یہ ''عالمِ کبیر'' کا پرتو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر دو قوتیں ودیعت کی ہیں، جن میں سے ایک خیر کی قوت ہے، جب کہ دوسری شر کی۔ اوّل الذکر کو ''ضمیر'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، جب کہ دوسری کو ''نفس'' کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کو محض عقل کے حوالے کرنے اور خیر و شر کی تعیین میں آزادانہ اختیار دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہم السلام کو مبعوث کیا، تاکہ لوگوں کو صحیح اور غلط راہ کی تمیز کرائی جا سکے اور انسان کو دو راستے ''نَجْدَیْن'' دکھلائے کہ سیدھا راستہ جو اللہ سے ملاتا ہے وہ کیا ہے اور شیطان کا راستہ کون سا ہے۔

> **نفس دل میں ودیعت کردہ ایک تاریکی ہے، جو برے اخلاق کا مقام اور برائی پر ابھارنے اور ہدایت کا انکار کرنے والی ہے۔**

ضمیر و نفس کی رسا کشی ہمیشہ سے چلی آرہی ہے کہ نفس بندے کو شیطان کے راستے پر چلانا چاہتا ہے، جو بدترین گمراہی اور ابدی خسران کا باعث ہے، جب کہ ضمیر انسان کو صراطِ مستقیم پر گامزن و ثابت قدم رکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ ہمیشہ کی فلاح و کامیابی اس کا مقدر ٹھہرے۔ انسان ان دونوں میں سے جس کے پیچھے بھی چلتا ہے، وہ قوت غالب آنا شروع ہو جاتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ نفس یا ضمیر میں سے ایک قوت کلی تسلط پا کر دوسری کو مغلوب و مطیع کر لیتی ہے۔ چوں کہ یہ دونوں متضاد قوتیں ہیں اس بنا پر ایک کو سمجھ لینے اور اس کے تقاضے جان لینے سے دوسری کا سمجھنا آسان ہے، کیوں کہ ''الأشیاء تعرف بأضدادھا''۔

فلاسفہ، متکلمین اور صوفیہ نے سب سے زیادہ نفس پر بحث کی ہے، اور ان کے نزدیک اس کی ماہیت و حقیقت مختلف فیہ ہے۔ اسی اختلاف کو لے کر قرونِ اولیٰ میں بہت سے فتنے ظاہر

ہوئے۔ اس لیے یہاں نفس کو زیرِ بحث لایا جا رہا ہے، تاکہ انسان اس کی حقیقت اور اس کے تقاضوں کو جان کر خود کو ہلاکت و ندامت سے بچا سکے۔

پہلے فلاسفہ کے نزدیک اس کی حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں۔ ارسطو کے مطابق یہ ایسی حقیقت ہے جو تدبیر، نشوو اِرتقا یا فنا کے دائرے سے بلند تر ہے۔ یہ ایسے جوہرِ بسیط سے تعبیر ہے، جو سارے عالمِ حیوانی میں جاری و ساری ہے۔ حیوانات سے اس کے تعلق کی نوعیت محض یہ ہے کہ اس کی تدبیر میں مصروف ہے۔ اس پر قلت و کثرت کی صفت کا اطلاق نہیں ہوتا اور اس کے باوجود کہ یہ سارے عالم میں جاری و ساری ہے، ذات اور ساخت کے اعتبار سے تقسیم پزیر نہیں، اور کائنات کے تمام حیوانات میں اس کا وجود تدبیر و عمل ہی کے معنوں میں ہے۔ (مقالات الاسلامیین للامام ابوالحسن الاشعری، مسلمانوں کے عقائد و افکار، ترجمہ از مولانا محمد حنیف ندوی، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۱۵ء، حصہ دوم، ص: ۴۴)

صوفیہ میں سے امام ابوالحسن شاذلی رحمہ اللہ نے نفس کی حقیقت کو جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نفس دل میں ودیعت کردہ ایک تاریکی ہے، جو برے اخلاق کا مقام اور برائی پر ابھارنے اور ہدایت کا انکار کرنے والی ہے۔ (موائد الفکر و القلب از بلال احمد البستانی الرفاعی الحسینی، ص ۸۴)

یہ نفس کی حقیقت ہے، تاہم اگر انسان اس کا تزکیہ کرنے پر آئے، تو یہ مختلف مقامات سے گزر کر ایک روشن لطیفہ اور انسانی روح کی سردار بن جاتی ہے۔ اس اعتبار سے نفس کے مختلف مراتب ہیں، جن پر حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ نے ''تفسیر معارف القرآن'' میں روشنی ڈالی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

نفس کی عام طور پر تین اقسام یعنی امارہ، لوامہ اور مطمئنہ بیان کی جاتی ہیں، جن کی تفصیل میں حضرات صوفیہ نے لکھا ہے: نفس اپنی اصل اور ابتدائی حالت میں ''نفسِ امارہ'' ہی ہوتا ہے، یعنی انسان کو برے کاموں اور معاصی کی طرف بلانے اور اس میں مبتلا کرنے کا داعی ہوتا ہے، لیکن ایمان و عمل صالح اور مجاہدات و ریاضت سے ''نفسِ لوامہ'' بن جاتا ہے کہ برائی و کوتاہی پر نادم ہونے لگتا ہے، مگر برائی سے بالکلیہ منقطع نہیں ہوتا ہے۔ پھر عملِ صالح میں ترقی اور قربِ حق کی

کوشش کرتے کرتے جب اس کا یہ حال ہو جائے کہ شریعت اس کی طبیعت بن جائے اور خلافِ شرع کام سے طبعی نفرت ہو، تو اس وقت ''نفسِ مطمئنہ'' ہو جاتا ہے۔(۸ / ۶۳۳)

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ''مکتوبات'' میں فرماتے ہیں: نفسِ امارہ انسانی حبِ جاہ و ریاست پر پیدا کیا گیا ہے، اور اس کا مقصود ہمہ تن ہمسروں پر برتری و فوقیت حاصل کرنا ہے، اور وہ بالذات اس بات کا خواہاں ہے کہ تمام مخلوقات اس کی محتاج اور اس کے امر و نہی کے تابع ہو جائیں، اور وہ خود کسی کا محکوم وہ محتاج نہ ہو، اور اس کا یہ دعویٰ خدائے بے مثل کے ساتھ اُلوہیت و شرکت کا ہے، بلکہ وہ بے سعادت شرکت پر بھی راضی نہیں ہے۔ چاہتا ہے کہ حکام خود آپ ہی ہو اور سب اس کے محکوم ہوں۔ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ ''عَادِ نَفْسَكَ؛ فَإِنَّهَا انْتَصَبَتْ بِمُعَادَاتِيْ''۔ یعنی اپنے نفس کو دشمن رکھ، کیوں کہ وہ میری دشمنی میں کھڑا ہے۔(۱/ ۲۱۱، ۲۱۲)

معلوم ہوا کہ نفس کی دشمنی لازم ہے۔ تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی موافقت نہ کی جائے، بلکہ آخرت کی فوز و فلاح کے لیے اس کی مخالفت کرنا ضروری ہے۔ اس کی مخالفت کے تین درجات ہیں، جنہیں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے ''تفسیر مظہری'' میں بیان کیا ہے۔

اوّل درجہ یہ ہے کہ انسان ان عقائد سے بچ جائے، جو ظاہرِ نصوص اور اجماعِ سلف کے خلاف ہوں۔ اس درجے میں پہنچ کر آدمی سنی (اہلِ سنت) مسلمان کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔

متوسط درجہ یہ ہے کہ کسی معصیت اور گناہ کا ارادہ کرے، پھر اسے یہ بات یاد آ جائے کہ مجھے اللہ کے سامنے حساب دینا ہے اور اس خیال کی بنا پر گناہ ترک کر دے۔ متوسط درجے کا تکملہ یہ ہے کہ آدمی شبہات سے بھی پرہیز کرے اور جس مباح و جائز کام میں مشغول ہونے سے کسی ناجائز کام میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اس کو بھی ترک کر دے.....

تیسرا درجہ مخالفتِ ہوائے نفس کا ہے کہ کثرتِ ذکر و مجاہدات کے ذریعے اپنے نفس کو ایسا مزکّٰی بنا لے کہ اس میں وہ ہوائے نفسانی باقی نہ رہے جو انسان کو شر کی جانب کھینچتی ہے۔ یہ مقام ولایتِ خاصہ کا مقام ہے، جو اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے، جس کو صوفیہ کی اصطلاح میں ''فانی فی اللہ اور باقی باللہ'' کہا جاتا ہے۔(معارف القرآن، ۸/ ۶۶۷، ۶۶۸)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یہی چاہتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو مطمئنہ بنا کر اپنے رب تک

پہنچیں۔اسی مقصد کے لیے اس نے اپنے منتخب بندوں کو بھیجا۔مجدد صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت اور شرعی تکلیفوں میں حکمت یہی ہے کہ نفس عاجز اور خراب (برباد) ہو جائے۔شرعی احکام نفسانی خواہشوں کو دفع کرنے کے لیے وارد ہوئے ہیں۔جس قدر شریعت کے موافق عمل کیا جائے گا، اس قدر نفسانی خواہشات میں کمی واقع ہو گی۔یہی وجہ ہے کہ احکامِ شرعی میں سے ایک حکم بجالانا نفسانی خواہشوں کے دور کرنے میں ان ہزار سالہ ریاضتوں اور مجاہدوں سے جو اپنے پاس سے کیے جائیں، کئی درجے بہتر اور فائدہ مند ہے، بلکہ ایسی ریاضتیں اور مجاہدے جو شریعت کے موافق نہ کیے جائیں، نفسانی خواہشوں کو مدد اور قوت دینے والے ہیں۔(مکتوبات، ۱/ ۲۱۳)

یہی وجہ ہے کہ یونانی فلاسفہ، ہندو جوگیوں اور بودھ بھکشوؤں نے ریاضتوں اور مجاہدوں میں کوئی کمی نہیں کی، لیکن ان میں سے کوئی مراد کو نہ پہنچا، بلکہ الٹا نفس کی تقویت اور سرکشی کے سوا انہیں کچھ حاصل نہ ہوا۔اسی طرح رومی اور یونانی فلاسفہ نے عقل کو بنیاد بنا کر اشراقِ باطن کی جانب توجہ دی، لیکن ان کو تنزیہ حاصل نہ ہو سکی اور وہ نفس کشی برائے نفس کشی میں الجھ کر رہ گئے۔ریاضتوں اور مجاہدوں کی حقیقت یعنی نفس کشی برائے اطمینانِ روح اور حصولِ رضائے ربانی میں ناکام رہے۔نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ''کرب'' کو انسانیت کی معراج قرار دیا اور اسی کو منتہا ٹھہرایا، جب کہ اسلامی تصوف کی بنیاد ہی کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ'' پر ہے، جو تمام معبودوں کی نفی پر مشتمل ہے، جس کی ابتدا رضائے باری تعالیٰ اور انتہا معرفتِ الٰہی قرار پاتی ہے۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کا تصوف دراصل نفسِ امارہ کو نفسِ مطمئنہ بنانے کی عملی مشق ہے اور یہ روح کی تسکین کا باعث بنتا ہے۔نیز جب کبھی نفس سرکشی کے درپے ہو اور اپنے عہد کو توڑ دے، تو اس کلمہ سے ایمان کی تجدید کرنا چاہیے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جَدِّدُوْا إِيْمَانَكُمْ بِقَوْلِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهَ''۔لا الٰہ الا اللہ کہہ کر اپنے ایمان کو تازہ کیا کرو۔چوں کہ نفسِ امارہ ہمیشہ اپنی شر انگیزیوں میں مصروف اور دل کو کچوکے لگاتا رہتا ہے، اسی لیے اس سے محفوظ رہنے کے لیے ذکر کو لازم پکڑنا چاہیے۔

مادہ قدیم یا حادث

مولانا محمد ابراہیم
شریک تخصص فی العقیدۃ والفکر الاسلامی

وجودِ باری تعالیٰ کے منکرین نے کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کو جھٹلانے کے لیے افکار کی صورت میں طرح طرح کے صنم تراش رکھے ہیں۔ خواہشاتِ نفس کے پیروؤں کو مذہبی حدود بیڑیاں معلوم ہوئیں، تو وہ حق فراموشی کی راہ پر چل پڑے۔ معبودِ حقیقی سے آنکھیں بند کرنے کے لیے خودساختہ باطل خداؤں کی گود میں جا بیٹھے۔ انہیں فریبوں میں سے ایک ''مادہ'' ہے، جسے مبدئے کائنات گردان کر خالقِ کون ومکاں کا انکار کیا جاتا ہے۔ یونان سے نشاۃِ ثانیہ تک کے فلاسفہ مادے کو قدیم، غیر مخلوق اور واجب لذاتہ قرار دیتے ہیں، اور اس کائنات کو اس کی حرکت سے ظہور پزیر مانتے ہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ یہ لوگ خود مادے کی حقیقت پر متفق نہیں ہیں۔

> **یونانی فلاسفہ کے نزدیک مبدئے کائنات مادہ ہے۔ حیات بھی اسی مادے کی طبیعی کیمیاوی ترکیب کی لطیف ترین صورت ہے۔**

پہلے تو یہ جان لیں کہ مادہ وہ عنصر ہے، جس سے تمام مادی اشیا بنی ہیں۔ سب سے پہلے قدیم یونانی فلاسفہ نے کائنات کے وجود کو عقل کی کسوٹی پر رکھ کر اس کی اصل جاننے کی کوشش کی اور یہ نظریہ قائم کیا کہ مبدئے کائنات ''ہیولیٰ'' ہے۔ ہیولیٰ (ہا کے زبر کے ساتھ یونانی زبان کا لفظ ہے)، جس کے معنی اصل اور مادے کے ہیں۔ اصطلاح میں ہیولیٰ اجسامِ طبیعیہ کا وہ جوہری جز ہے، جو اتصال (ملاپ) اور انفصال (جدائی) کو قبول کرتا ہے۔ خود اس کی نہ کوئی خاص شکل ہوتی ہے نہ کوئی معین صورت۔ البتہ وہ ہر شکل وصورت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہیولیٰ بذاتِ خود نہ متصل ہوتا ہے نہ ہی منفصل، لیکن وہ ان تمام صفات کو قبول کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔ (معین الفلسفہ از مفتی سعید احمد پالن پوریؒ، مکتبۃ البشریٰ کراچی، ۱۴۳۳ھ، ص: ۴۶)

گویا فلاسفۂ یونان کے نزدیک مبدئے کائنات ''مادہ'' ہے اور ''حیات'' اسی مادے کی طبیعی

کیمیاوی ترکیب کی لطیف ترین صورت ہے، جب کہ ''نفس'' یا ''ذہن'' اسی مادے کی ایک عضویاتی ترکیب کا مظہر ہے۔قدیم یونان میں دیموقراطیس اور لیوکراشنس اس نظریے کے مشہور مبلغ گزرے ہیں۔افلاطون مادے کو''لا شے'' تصور کرتا ہے۔اس کے نزدیک مادہ نظر آنے والی دنیا کے متغیر پہلوؤں کی ترجمانی کرتا ہے، جب کہ ارسطو نے مادے کو ایک متعین اور ٹھوس شکل دی ہے۔اس کے نزدیک ''مادہ اور صورت'' دونوں مل کر اشیا کو متعین اور ٹھوس شکل دیتے ہیں۔ارسطو کے الفاظ میں مادہ تغیر پزیر ہونے کی استعداد یا امکان کے مترادف ہے۔

یونانیوں کے بعد بھی فلاسفہ اس پر کلام کرتے رہے اور یہ ہر دور میں فلسفے کا معرکۃ الآرا مسئلہ بنا رہا۔نشاۃِ ثانیہ کے بعد یہ مسئلہ پھر زندہ ہوا، تو مغربی فلاسفہ نے بھی مختلف نظریات قائم کیے۔ ڈیکارٹ نے مادے کو جوہرِ مُمتد (قابلِ پھیلاؤ) سے تعبیر کیا، جو ان تمام صفات کا حامل ہے، جنھیں اس شے سے متعلق واضح محسوس کیا جاسکتا ہے، جو خود ممتد ہو۔جان لاک کے نزدیک مادہ صفات کی اس ذیلی درجہ بندی پر مشتمل ہے، جو نا معلوم اور اِمکانِ علم سے خارج ہے۔البتہ جارج بارکلی نے مادے کے تصور ہی کا انکار کر دیا۔اس کا کہنا ہے کہ کسی شے کا جوہر اِدراک پر مشتمل ہوتا ہے اور ہمیں مادے کا کوئی ادراکی علم نہیں ہوتا۔(فلسفے کے بنیادی مسائل از قاضی قیصر الاسلام، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص:۷۵)

اس تفصیل کی روشنی میں مادے کی ماہیت کو ذہن کے ساتھ اس کا تقابل کرکے زیادہ بہتر انداز میں سمجھا جاسکتا ہے، کیوں کہ ذہن کی بنیادی صفت شعور ہے اور وہ نہ جگہ گھیرتا ہے نہ ممتد ہے، جب کہ مادے کی اصل صفت اِمتداد (پھیلاؤ) ہے اور یہ جگہ گھیرتا ہے۔نیز اس کا طبعی وجود تو ہوتا ہے، لیکن یہ شعور نہیں رکھتا۔بہر حال مغربی فلاسفہ اس گتھی کو سلجھا نہیں پائے، لیکن وہ بھی مادے کو مبدئے کائنات، قدیم، غیر مخلوق اور واجب لذاتہ سمجھتے ہیں۔

ان کا یہ نظریہ باطل ہے اور علمائے علم الکلام نے اس کا بطلان کئی دلائل سے کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ مادہ اگر قدیم، غیر مخلوق اور واجب لذاتہ ہے، تو پھر اس نظریے کے قائلین کو مادے کو خدا تسلیم کرنا چاہیے، لیکن ایسا دکھتا نہیں۔کیا وجہ ہے کہ وہ لازم کو تو مانتے ہیں، ملزوم کو نہیں مانتے؟

پھر ہر شے کے اوصاف وکمالات وجود کے تابع اور قوت ووسعت میں اسی جیسے ہوتے ہیں۔

اگر مادہ قدیم ہے، تو اس کا وجود کامل اور اوصاف اسی کی طرح قدیم ہونے چاہییں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس میں عیوب ونقائص موجود ہیں اور شکست وریخت کا عمل جاری ہے۔ نیز یہ اصل ہونے کے باوجود مختلف اجسام اور ہیئتوں میں بند کیوں ہے؟ تو مادہ کیسا کامل الوجود ہے، جو خود کو ان سے محفوظ نہیں رکھ سکا؟ نیز کامل کیسے کسی کے تابع ہو سکتا ہے؟

اسی طرح کائنات میں بھانت بھانت کی، رنگ برنگی، مختلف الشکل اشیا موجود ہیں اور ان کے احوال میں فرق ہے۔ اگر ان کا وجود مادے اور اس کی حرکت کا مرہونِ منت ہے، تو ان کے احوال بھی یکساں ہونے چاہییں۔ پھر تمام ستاروں کی روشنی اور سیاروں کی حرکت ایک سی کیوں نہیں؟

سب لوگ اشیا کو حادث مانتے ہیں، یعنی انسان، حیوان اور نبات عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ علت یعنی مادہ اور اس کی حرکت تو قدیم ہیں، لیکن معلول یعنی کائنات کی ساری رنگینی وحیات حادث ہے۔ گویا علت تو موجود تھی، معلول نہیں تھا، حالاں کہ یہ محال ہے۔ معلول اپنی علت کے تابع ہوا کرتا ہے۔ اگر معلول یعنی کائنات حادث ہے، تو ثابت ہوا کہ مادہ بھی حادث ہے۔

اسی طرح کسی جسم کا قدیم وحادث سے مرکب ہونا بھی محال ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر شے مادے اور صورت کا مرکب ہے۔ مادے کو قدیم ماننے والے بھی صورت کو حادث مانتے ہیں۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ صورت کو بھی قدیم مانیں، ورنہ مادے کو حادث تسلیم کریں۔

قدیم شے میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ یہ محال ہے۔ مادہ اگر قدیم ہے، تو اس میں اتنی تبدیلیاں کیوں رونما ہوتی ہیں؟ بلکہ اس عالم میں مادہ سب سے زیادہ تغیر پزیر شے مانا جاتا ہے اور تغیر کے لیے غیر کی مداخلت ضروری ہے، تو یہ کیسا قدیم ہے کہ جس کے وجود میں دوسرے کی دخل اندازی ہے، جس کی بنا پر اس میں تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔

کائنات کی تمام اشیا محدود اور متناہی ہیں، اس لیے ان کا مادہ بھی محدود اور متناہی ہے، جب کہ قدیم لامحدود اور غیر متناہی ہوتا ہے۔ اس لیے بھی مادے کا قدیم ہونا محال ہے۔

مادے کی حقیقت استعداد اور قابلیت ہے، جب کہ قدیم کی تمام صفات بالفعل ہوتی ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اس کی کوئی صفت پہلے سے موجود نہ ہو، بلکہ مستقبل میں اس کے ظہور یا حصول کی توقع کی جائے، جیسا کہ مادے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

پھر قدیم کا بسیط ہونا بھی ضروری ہے کہ وہ مرکب یا مقدار والا نہ ہو، جب کہ سائنس یہ بات ثابت کر چکی ہے کہ مادہ مختلف اجزا کا مرکب ہے۔

اسی طرح قدیم کا دوسرے سے مستغنی و بے نیاز ہونا بھی ضروری ہے، جب کہ مادے سے بنا یہ عالم لاچاری و عاجزی کی تصویر ہے۔ ہر شے کو اپنے وجود کے لیے دوسرے کا سہارا درکار ہے۔

ہر ممکن شے اور اس کی صفات اپنے وجود میں قدیم سے کم تر ہوتی ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ مادے میں تو شعور و ادراک نہیں، لیکن ہم میں موجود ہے۔ گویا مادہ خود جس صفت کا حامل نہیں تھا، اس نے ہمیں وہ ودیعت کر دی۔ ظاہر ہے یہ بھی غلط ہے۔ (انسانی شعور کو دماغ کی مادی یا کیمیائی سرگرمیوں کا نتیجہ قرار دے کر اسے نظر کا فریب کہنے سے بھی انسانی شعور کی نفی نہیں ہوتی۔)

کائنات میں سب سے زیادہ شعور انسان کو حاصل ہے اور اس کا اپنا یہ حال ہے کہ مچھر کا پر تک نہیں بنا سکتا، تو پھر شعور و ادراک سے عاری مادے نے اتنی بڑی کائنات کو کیسے وجود بخش دیا؟

مادہ ادراک اور ارادے و اختیار سے عاری ہے۔ اگر مادے کے ارادے و اختیار سے عالم میں تغیرات واقع نہیں ہو رہے، تو وہ کون سی قوت ہے، جو یہ سب کر رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ ذاتِ باری تعالیٰ ہی ہے، جس کے ارادۂ محض سے ہر شے میں تغیر و تبدل ہے اور کائنات کی یہ رنگینی اسی کی مشیت کی مرہونِ منت ہے۔ (ملخص از علم الکلام، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، زمزم پبلشرز کراچی، ۲۰۰۳ء، ص: ۶۱-۷۴)

ان دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مادہ قدیم، غیر مخلوق اور واجب لذاتہ نہیں، بلکہ حادث ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ذات ایسی موجود ہے، جس نے اسے اور تمام موجودات کو عدم سے وجود بخشا ہے۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ یہ سب کچھ خود بہ خود وجود میں آیا ہے، تو یہ دعویٰ بھی باطل ہے، کیوں کہ دنیا میں ایک پتہ بغیر کسی سبب کے نہیں ہلتا، تو اتنی بڑی کائنات بلا سبب کیسے وجود میں آ سکتی ہے۔ اس لیے ہر شے خلاقِ عالم کی صناعیت کی مظہر ہے۔ بقول اکبرؔ:

ہر ذرّہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

علاماتِ قیامت سے متعلق معاصر روش

مولانا واجد عالم
استاذ معہد الشروق الاسلامی

اس جہانِ رنگ و بو کا اختتام ایک عظیم سانحے پر ہونا ہے، جسے قیامت کہا جاتا ہے۔ کائنات کی تخلیق کے بعد یہ سب سے بڑا حادثہ ہوگا، کیوں کہ پورے عالم کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور لوگ پریشانی کے عالم میں قبروں سے اُٹھ کر میدانِ حشر کی جانب چل پڑیں گے۔

یہ عظیم واقعہ چوں کہ طے شدہ ہے، اس لیے اس کی آمد سے قبل کچھ ایسے حوادث ووقائع رونما ہونا بدیہی ہے، جو غیر معمولی اور خارقِ عادت ہوں گے۔ دنیا میں طوفان، آندھی یا بارش سے قبل کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں، جو ان کی آمد کا پتا دیتے ہیں۔ یہی معاملہ قیامت کا ہے کہ اس کے آنے سے قبل کچھ بڑے واقعات وحادثات رونما ہونے ہیں، جنہیں علاماتِ قیامت کہا جاتا ہے۔ ان پر ایمان لانا ایمان بالغیب کا حصہ ہے، اس لیے ان کا انکار صریح گمراہی ہے۔ البتہ اسلام نے ہم سے صرف اتنا تقاضا کیا ہے کہ ہم ان کی تصدیق کریں، لیکن اس معاملے میں ہمارا رویہ تطبیق کا ہو چلا ہے، جو خطرناک ہے۔

> **علاماتِ قیامت سے متعلق صرف راسخ فی العلم حضرات ہی سے رہنمائی لینا اور ان ہی کی تحقیقات کو اختیار کرنا چاہیے۔**

عصرِ حاضر میں مسلمانوں کی علاماتِ قیامت میں غیر معمولی دلچسپی، حوادثِ زمانہ اور معمولی معمولی واقعات کو رسول اللہ ﷺ کی پیشینگوئیوں سے جوڑنا یا صہیونیت، عالمی حکومت اور بین الاقوامی تنازعات کا مغیبات سے ربط تلاش کرنا، باعثِ تشویش ہے۔ یہ طرزِ عمل مسلمانوں میں کم ہمتی پیدا کرتا ہے۔ مورال گراتا ہے۔ اسلام دشمن طاقتوں کو ناقابلِ تسخیر سمجھنے کا خبط پیدا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین کو کم کرتا ہے اور بے عملی کی جانب لے جاتا ہے۔ حالاں کہ علاماتِ قیامت بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم آنے والے فتنوں اور آزمائشوں سے پیشگی آگاہ ہوں، اور ان کا اجمالی علم حاصل کر کے اپنی ہمت مجتمع رکھیں۔

علاماتِ قیامت سے متعلق مسلمانوں کی معاصر روش کو پروان چڑھانے میں اس موضوع پر گزشتہ چند دہائیوں میں منظرِ عام پر آنے والی کتابوں کا بڑا کردار ہے۔ مضامین، وڈیوز اور سوشل میڈیا نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے، جو اپنے گمان کو حدیث کا مصداق قرار دینے میں بے باک ہے۔

بہر حال یہ طرزِ عمل قابلِ اصلاح ہے، اور اس کے کچھ اسباب اور وجوہات ہیں، جنھیں سمجھ کر ہم شرعاً ناپسندیدہ اس روش سے بچ سکتے ہیں۔

اس کی بڑی وجہ فتنوں کی کثرت ہے، جسے حدیث میں گہری تاریک رات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس بہتات کے باعث ان کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ انسان کے لیے تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ کون سا فتنہ علاماتِ قیامت میں سے ہے اور کون سا نہیں۔ اس لیے لوگوں کو مغالطہ لگ جاتا ہے۔

فحاشی، عریانی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں اس طرح پھیل گئی ہیں کہ انھیں شمار کرنا ممکن نہیں۔ ایک مسلمان جب اس اخلاقی گراوٹ کو دیکھتا ہے، تو اسے ہلاکت خیز گناہوں کی فہرست پر مشتمل احادیث اور ان میں موجود عذاب کی وعیدیں یاد آتی ہیں، اس لیے وہ اس دور کو آخری زمانہ سمجھتا ہے، جس کی بنا پر رونما ہونے والے واقعات کو علاماتِ قیامت میں شمار کرنے لگتا ہے۔

اس طرزِ عمل کی ایک اہم وجہ علما راسخین کی بڑی تعداد کا دنیا سے چلے جانا ہے۔ پیچھے رہ جانے والوں میں علمی رسوخ اس درجے کا نہیں اور جن میں ہے بھی، تو وہ انتہائی تھوڑے ہیں۔ اس صورت حال میں وہ لوگ اُمت کو علاماتِ قیامت سے متعلق تحریری و مرئی مواد پیش کر رہے ہیں، جو کسی نہ کسی فکر یا نظریے کے ہاتھوں مغلوب ہیں، اور یہ سوچ انھیں اس معاملے میں اسلاف کی طرف دیکھنے اور ان کا منہج اختیار کرنے سے باز رکھتی ہے۔ حالاں کہ خوف اور مایوسی کی صورت میں تو خاص طور پر راسخ فی العلم حضرات ہی سے رہنمائی لینے کا حکم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذَا جَآءَهُمۡ أَمۡرٞ مِّنَ ٱلۡأَمۡنِ أَوِ ٱلۡخَوۡفِ أَذَاعُواْ بِهِۦۖ وَلَوۡ رَدُّوهُ إِلَى ٱلرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُوْلِي ٱلۡأَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ ٱلَّذِينَ يَسۡتَنۢبِطُونَهُۥ مِنۡهُمۡ﴾ (نسا: ۸۳)

اور جب ان کے پاس کوئی خبر امن یا ڈر کی پہنچتی ہے، تو اسے مشہور کر دیتے ہیں، اور اگر

اسے رسولؐ اور اپنی جماعت کے ذمے دار اصحاب تک پہنچاتے، تو ان میں تحقیق کرنے والے اس کی تحقیق کرتے۔

اس لیے علاماتِ قیامت سے متعلق صرف راسخ فی العلم حضرات ہی سے رہنمائی لینا اور ان کی تحقیقات کو اختیار کرنا چاہیے۔ اسی طرح علمائے ربانیین کی بھی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اس باریک وحساس معاملے کو اپنے ہاتھ میں رکھیں اور لوگوں کو اس سے متعلق درست طرزِ عمل بتائیں۔

عالمی منظر نامہ، مسلمانوں کی پستی و کمزوری، مظلومیت اور ہر جگہ ان کا تختۂ مشق بنایا جانا بھی اس غیر سنجیدہ روش کی ایک وجہ ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں اسلامی اراضی پر استعمار کے قبضے، پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر خلافتِ اسلامیہ کے حصے بخرے، دوسری جنگِ عظیم کے بعد شروع ہونے والی آزادی کی تحریکوں میں مسلمانوں پر جبر وستم اور استیصال اور نائن الیون کے بعد اسلام کے خلاف محاذ آرائی نے مسلمانوں کو کمزور وکم ہمت کر دیا ہے۔ وہ ان حالات میں کوئی مسیحا نہیں پاتے، تو حالاتِ حاضرہ پر علاماتِ قیامت کو منطبق کر کے قریب ہی ایک اچھے مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں۔ حالاں کہ اس صورت حال میں ضرورت عزم، ہمت، حوصلے، صبر، جہدِ مسلسل اور خود کو قربانی کے لیے پیش کرنے کی ہے۔ اعمالِ خیر کی مقدار و کیفیات بڑھانے کی ہے۔

علاماتِ قیامت میں بے جا غور وخوض کی سب سے بڑی، اہم اور خطرناک وجہ اسرائیلیات، صحائفِ قدیمہ کے بیانات، دیگر مذاہب کے پیشواؤں کی موشگافیوں، کاہنوں ونجومیوں کی پیشینگوئیوں، پُراسرار و پوشیدہ عالمی تنظیموں اور سازشی نظریات میں مسلمانوں کی حد سے زیادہ دلچسپی اور اچھنبے کی بے اعتدال آرا سے تلذذ حاصل کرنا ہے۔ مسلمانوں میں معلومات کے اظہار کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے، جس میں اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے ایسی آرا پیش کرنا ناگزیر سمجھا جا رہا ہے، جنہیں سن کر لوگ ورطۂ حیرت میں پڑ جائیں۔ اس لیے علاماتِ قیامت اور ان کی تطبیق سے متعلق ہر رطب ویابس پھیلایا جا رہا ہے۔ فتنہ شناسی وآگاہی کے نام پر حق وباطل کی آمیزش سے نئے نئے فتنے کھڑے کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس غلط روش کو ترک کیا جائے اور باقی دین کو چھوڑ کر صرف علاماتِ قیامت کے درپے ہونے سے بچا جائے۔

علمی ورثے کا اِحیا

مولانا محمد سعد ڈیروی
استاذ معہد الشروق الاسلامی

''تراث'' یعنی ورثہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ایک مال و زر کی تراث دوسری فکری تراث۔ مال و زر کی تراث کا کوئی فرد یا گروہ ہی مالک ہوا کرتا ہے،لیکن فکری تراث کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں ہوتی۔علومِ دنیویہ و اخرویہ کا جو ذخیرہ اس عالم میں جہاں کہیں بھی موجود ہے، وہ اس آخری اُمت کی فکری تراث و علمی سرمایہ ہے۔البتہ اس تراث کے جو نقوش و خطوط جس چیز پر ثبت ہیں، مثلاً کاغذ، چمڑا، ہڈی وغیرہ وہ کسی نہ کسی کے تصرف میں ہو سکتے ہیں،لیکن ان نقوش سے پھوٹنے والی علم کی روشنی سے استفادے میں سب یکساں ہیں۔مغرب نے اپنے پاس محفوظ فکری ذخیرے کی حفاظت کے لیے بہت اچھی کاوشیں کی ہیں۔پھر اس سے استفادے کے لیے علم کے پیاسوں کے لیے سبیل بھی پیدا کر رکھی ہے۔اس برقی دور میں برقی رابطے کے ذریعے کچھ معاوضے کے بعد آپ اپنی مطلوبہ دستاویز تک پہنچ سکتے ہیں اور عالمِ اسلام میں علمائے عرب نے اپنی وسعت کے بقدر تراث کی حفاظت کی بھرپور کوشش کی ہے۔مجمع اللغہ العربیہ دمشق، مجمع العلمی العراقی، مؤسسۃ الفرقان لندن، مرکز جمعہ الماجد للتراث اور اس طرح کے کئی دیگر ادارے وجود میں آئے، جنہوں نے دنیا بھر سے مخطوطات جمع کر کے حفاظت اور نشر و اشاعت کا اہتمام کیا،لیکن نہایت افسوس کے ساتھ ہمارے برِصغیر میں اس طرح کا کوئی قابلِ ذکر اقدام نظر نہیں آتا، بلکہ مخطوطات کی جو لائبریریاں ہمارے ہاں موجود ہیں، ان سے استفادہ ناممکن نہ سہی،لیکن انتہائی مشکل ضرور ہے۔

علمی ورثے کا احیا بہت بڑا عنوان ہے۔تراث کا اِحیا کس طریقے سے ہوا؟ کب ہوا؟ کون سے کردار شامل رہے؟ غرض ایک پوری تاریخ ہے، جسے چند صفحات میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تراث کے احیا کا ایک اہم سبب طباعت کی ایجاد ہے۔اس مضمون میں بس اسی ایک پہلو پر نظر ڈالی جا رہی ہے، استیعاب کی گنجایش ہے نہ وہ مقصود ہے۔

عالمِ طباعت

فنِ طباعت سے دنیا قدیم زمانے سے واقف ہے اور اس کی ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر سمجھا جاتا ہے۔ چینیوں نے اپنے پیشوا گوتھم بدھ کی تصاویر اور ان کی تعلیمات عام کرنے کے لیے ۱۵۰ء میں بلاک کی چھپائی کا استعمال کیا۔ برٹش میوزیم میں محفوظ قدیم ترین طباعت کا نمونہ ۷۷۰ء کا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں چینی فنِ طباعت سے واقف تھے۔ یورپ میں یہ فن بارہویں صدی عیسوی میں پہنچا، لیکن اس کا استعمال آرائشی رہا۔ چودہویں صدی میں تاش کے پتوں کی طباعت ہوئی اور اس کو ترقی پندرہویں صدی کے وسط میں اس وقت حاصل ہوئی جب الگ الگ حروف کے ٹائپ ایجاد ہوئے۔ یورپ میں اس فن کے موجد پر اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا سہرا ہالینڈ کے باشندے لارنس جان زور کوسٹر کے سر ہے، جب کہ بعض جرمن شہری جان گٹن برگ کو اس کا موجد کہتے ہیں۔ مؤخر الذکر زیادہ مشہور ہے۔ جان گٹن برگ نے ۱۴۳۶ء میں جرمنی میں مطبع قائم کیا اور ۱۴۵۰ء میں تورات شریف طبع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

عربی میں اوّلین طباعت سولہویں صدی عیسوی میں اٹلی کے شہر فانو میں ہوئی۔ پوپ لیوس ثانی کے حکم سے فانو میں عربی مطبع قائم ہوا اور اس کا افتتاح پوپ لیو عاشر نے ۱۵۱۴ء میں کیا۔ ۱۵۱۶ء میں زبور شریف کی طباعت کا اہتمام کیا گیا۔ اٹلی کے شہر بندقیہ یعنی وینس میں پہلی مرتبہ قرآنِ کریم کی طباعت ہوئی، لیکن حکومتِ وقت نے قرآن مجید کے اطالوی قوم اور عقائد پر اثر انداز ہونے کے خوف سے اس کے تمام نسخے ضبط کر لیے۔ ۱۵۴۷ء میں قرآن مجید کا اطالوی زبان میں ترجمہ طبع ہوا۔ ۱۵۹۳ء میں روم میں علمِ طب پر ابنِ سینا کی کتاب القانون اور دیگر کتب جیسے علم المنطق، علم الطبیعی اور کتاب النجاۃ طبع ہوئیں۔ القانون کی طباعت سے علمِ طب کا ایک نیا دور شروع ہوا اور ساتھ ہی یورپ میں عربی مطابع کی کثرت ہوگئی۔ مشرقی علوم کی کئی کتابوں کی طباعت ہوئی۔ اکثر مطابع لندن، پیرس، لائپزگ، لائیڈن، گوٹنگن، روم، فانو، برلن اور پیٹرس برگ میں واقع تھے۔

عالمِ اسلام میں طباعت کا اہتمام سب سے پہلے سوریا (شام) میں ہوا۔ اس کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کے دار الخلافہ آستانا (استنبول) میں طباعت شروع ہوئی۔ ۱۷۰۲ء میں سوریا میں انجیل شریف اور دیگر مسیحی کتب کی طباعت ہوئی۔

مطابعِ آستانا:

عثمانی فنِ طباعت سے پندرہویں صدی عیسوی یعنی جان گٹن برگ کی ایجاد کے تقریباً ۴۰ سال بعد ہی واقف ہو گئے تھے۔ جان گٹن برگ نے یہ ایجاد یہود کے تعاون سے کی تھی۔ یہود نے عبرانی حروف کے ٹائپ میں مدد کی، تاکہ وہ اپنی بعض دینی کتب کی طباعت کا اہتمام کر سکیں، تاہم عثمانیوں نے اس خوف سے ان مطابع کے استعمال سے گریز کیا کہ اگر مطابع کا غلط استعمال ہوا اور کوئی غلطی واقع ہو گئی، تو قرآن وسنت اور اسلامی تراث میں تحریف وتشویہ ہو گی، اور کثرتِ نسخ کی وجہ سے غلطیاں بھی عام ہو جائیں گی۔ دراصل یورپی مطبوعات میں مطبعی غلطیاں کثرت سے ہوئی تھیں۔ ان تمام وجوہ کے پیشِ نظر سلطان بایزید ثانی (۱۴۴۴ - ۱۵۱۲ء) نے حکم جاری کیا کہ یہود کے علاوہ کوئی مطابع استعمال نہ کرے۔ یہ حکم نامہ سلطان سلیم اوّل (۱۴۷۰-۱۵۲۰ء) کے عہد تک جاری رہا اور اس دوران یہودی مطابع نے سلطنتِ عثمانیہ میں اپنی بہت سی کتب شائع کی، جن میں سعید فیومی کا تورات کا عربی ترجمہ بھی شامل تھا۔ یہودی مطابع سلطنتِ عثمانیہ پر چھائے رہے، یہاں تک پیرس میں سلطنتِ عثمانیہ کے سفیر محمد چلپی پاشا کے بیٹے سعید آفندی کو مطبع کی اہمیت کا یقین ہو چلا اور وہ اس تجربے کو سلطنتِ عثمانیہ منتقل کرنے کے لیے متفکر ہوا۔ وہ آستانا واپس لوٹ کر عثمانی مفکرین وعمائدین کو جمع کیا اور انہیں مطبع کی اہمیت پر قائل کیا۔ یہاں تک کہ اس وقت کے شیخ الاسلام عبداللہ آفندی نے ۱۷۱۶ء میں صرف علومِ طبیعی کی اشاعت کا فتویٰ دے دیا۔ بعد میں ایک اور فتوے میں کتبِ دینیہ کی اجازت بھی دے دی گئی۔ اجازتِ سلطانی سے سعید آفندی نے اپنے شریک ابراہیم آفندی کے ساتھ مطبع قائم کیا اور ۱۷۲۸ء میں پہلی عربی کتاب ''تحفۃ الکبار فی اسفار البحار'' طبع کی۔ یہاں سے مطابع کا قیام عمل میں آیا اور ان مطابع میں سے مطبعۃ الجوائب کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔

مطبعۃ الجوائب :

اس کی بنیاد اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں رکھی گئی۔اس کے بانی احمد فارس شدیاق ایک معروف صاحبِ علم شخصیت تھے۔اس مطبع نے خوب نام کمایا اور عربی زبان میں درجنوں اہم کتابوں کی طباعت کا اہتمام کیا۔ایک رسالے ''الجوائب'' کا بھی اجرا کیا، جو خوب پڑھا گیا۔

مطابعِ لبنان و شام :

پھر لبنان کے اندر طباعت کا رجحان ہوا اور ایسا ہوا کہ یہ اس ملک کی وجہ شہرت بن گیا، جو آج تک متواتر چلی آ رہی ہے۔اس کا دارالحکومت بیروت اب بھی طباعت کا بڑا بین الاقوامی مرکز سمجھا جاتا ہے۔لبنان اور شام کے قدیم مطابع میں سے چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

مطبع قزحیا :

اس نے پہلے پہل سریانی زبان میں طباعت کی، پھر عربی پر منتقل ہوگیا۔اس مطبع نے دینی کتب شائع کیں۔

مطبع الشویر :

اس مطبع کی بنیاد ماہرِ طباعت وادیب شیخ عبداللہ زاخر حلبی نے رکھی تھی۔شیخ عبداللہ کو حلب میں عربی وعبرانی زبانوں کی طباعت کا تجربہ تھا اور انہوں نے شام کے شہر حلب میں نصاریٰ کی کتابوں کے طباعتی امور سرانجام دیے تھے۔وہ عربی حروف کی صناعت کے ماہر تھے۔اس مطبع سے بھی دینی کتب کی اشاعت کا اہتمام ہوا۔

مطبع قدیس جارجویس :

بیروت میں قدیم ترین مطبع تھا۔آرتھوڈوکس مسیحی مذہب کی اشاعت کے لیے ۱۷۵۳ء

میں شیخ نقولا یونس جبیلی معروف بہ ابوعسیر کی کوشش سے اس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ مسیحی کتب کے علاوہ اس مکتبے سے ادب و تاریخ کی کتابیں بھی شائع کی گئیں۔

مطبع امریکیہ برائے امریکی مبعوثین :

پہلے اس کی بنیاد مالٹا میں ۱۸۲۲ء میں رکھی گئی۔ پھر ۱۸۳۴ء میں یہ بیروت منتقل کیا گیا۔ اس مطبع سے علوم ِطب و ریاضی اور بعض علوم ِعربیہ کی کتابوں کی اشاعت ہوئی۔

شام کے مختلف شہروں میں مطابع قائم ہوئے۔ ان میں ایک مرحوم خلیل الخوری صاحبِ ''حدیقۃ الاخبار'' کا مطبعۃ السوریہ ہے، جو ۱۸۵۷ء میں جاری ہوا۔ اس کے علاوہ مطبعۃ المعارف بستانی ۱۸۶۸ء میں اور خلیل شرکس کا مطبعۃ اللسان ۱۸۷۳ء میں قائم کیا گیا۔

مطابعِ مصر :

مصر میں طباعت اور ترویجِ علم کی تحریک عظیم الشان انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ مصر میں طباعت تھوڑی تاخیر سے شروع ہوئی، لیکن اس نے علمی دنیا میں ایک تاریخ رقم کر دی۔ مصر میں طباعت تاخیر سے کیوں شروع ہوئی؟ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مصر پر فرانس کے حملے جاری تھے اور امن و امان کی صورت حال اچھی نہ تھی۔ یہاں مصر کے چند معروف مطابع کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

مطبع اہلیہ :

اس مطبع کا قیام فرانسیسی حملہ آوروں کے جہاز لوریاں شرق میں ہوا، جسے مارشل نپولین بونا پارٹ اپنے ساتھ لایا تھا، تاکہ سیاسی دستاویز اور حکم ناموں کو عربی میں طبع کر کے تقسیم کیا جا سکے۔ پھر حملے کے بعد اسے قاہرہ منتقل کر دیا گیا اور کتابوں کی نشر و اشاعت ہونے لگی۔ یہ مطبع ۱۸۰۱ء میں فرانسیسی انخلا تک کام کرتا رہا۔

مطبع بولاق :

بولاق اصل میں قاہرہ کا ایک ضلع ہے۔ یہ مطبع اسی شہر میں قائم کیا گیا اور اپنی شہرت میں کمال کو پہنچا۔ آج بھی اس کی مطبوعات ضبط و اتقان میں اپنی مثال آپ اور ہر لحاظ سے گراں قدر جانی جاتی ہیں۔ مصر سے فرانسیسی انخلا کے بعد مطبع اہلیہ بیس سال تک بند پڑا رہا، یہاں تک کہ امیر محمد علی پاشا نے بونا پارٹ کے اس معطل مطبع پر ۱۸۲۱ء میں اپنا مطبع قائم کیا اور اس کا نام بھی مطبع اہلیہ رکھا۔ بعد میں یہ مکتبہ بولاق شہر منتقل ہوا، تو مطبع بولاق کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی ادارت مسا بکی شامی کو دی گئی۔ مسا بکی نے روم میں چار سال طباعت کی مہارت حاصل کی تھی۔ جامعۃ الازہر کے طلبہ کو ٦ سال کی خصوصی مشق کے بعد مکتبے میں بطور محرر و مصحح رکھا گیا۔ مطبع بولاق میں کام کرنے والوں میں حسین حسنی باشا بہت معروف ہوئے۔ انہوں نے ۱۸۵۱ء میں وہاں کام شروع کیا۔ ۱۸۸۰ء میں اس کی ادارت سنبھالی اور مصر میں پہلی کاغذ فیکٹری کی بنیاد رکھی۔ اس سے قبل اٹلی سے کاغذ درآمد کیا جاتا تھا۔ مطبع بولاق تقریباً ایک صدی تک کام کرتا رہا اور علومِ عربیہ و اسلامیہ کی خوب خدمت کی۔ مطبع سے دو قسم کی مطبوعات چھپتی تھی، ایک حکومتی اور دوسری غیر حکومتی۔ حکومتی مطبوعات مطبع امیریہ کے نام سے شائع کی جاتی تھیں، جب کہ دیگر مطبع بولاق کے نام سے۔ چالیس سال تک چند ایک حکومتی مطابع کے علاوہ کوئی مطبع نہیں تھا، تاہم پھر مزید مطابع وجود میں آئے، مثلاً ۱۸٦۰ء میں مطبع وطن، ۱۸٦٦ء میں مطبع وادی النیل اور مطبع جمعیۃ المعارف وغیرہ۔ پھر یہ سلسلہ وسیع ہوتا گیا۔

المکتبہ المیمنیہ :

اس کی بنیاد سید احمد البابی الحلبی نے ۱۸۹۹ء میں رکھی۔ احمد البابی خود معروف عالم فاضل تھے۔ اس مکتبے نے علومِ عربیہ کی کتب کی اشاعت کا اہتمام کیا اور خوب کیا۔

دار الکتب العربیہ الکبریٰ :

سید احمد حلبی کی وفات کے بعد مکتبہ اسی نام سے کام کرتا رہا اور اس کی ادارت طویل عرصے

تک ان کے بھتیجے مصطفیٰ، عیسی اور بکری کرتے رہے۔ ۱۹۲۸ء میں یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، ایک ''مکتبہ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ'' اور دوسرا ''دار احیاء الکتب العربیہ'' سے معروف ہوا۔ مکتبہ مصطفیٰ نے تراث کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

مکتبۃ الخانجی :

سید محمد امین الخانجی تراث کی نشر و اشاعت میں ایک معروف نام ہے۔ ان کے بارے میں اُدَبا کا خیال ہے کہ ان کے زمانے میں آپ کوئی ایسا عالم و ادیب نہ پائیں گے، جس پر ان کا احسان نہ ہو۔ انہوں نے عربی کتب سے ایسی محبت کی کہ جیسے یہ ان کے والدین کی میراث ہو۔ انہوں نے عالمِ عرب کے اسفار کر کے نادر و نایاب مخطوطات حاصل کرنے کے بعد ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا۔ ان کی وفات ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے محمد نجیب خانجی نے اپنے والد مرحوم سے جو ذوق پایا تھا، اسی کے مطابق کتب کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرتے رہے۔

المکتبۃ السلفیۃ :

علومِ اسلامیہ و عربیہ کی نشر و اشاعت میں ایک معروف نام مکتبہ سلفیہ کا بھی ہے۔ اس کی بنیاد استاذ محب الدین الخطیب اور عبد الفتاح قتلان نے ۱۹۲۰ء میں رکھی۔ بعد میں اس کی مستقل ادارت محب الدین الخطیب کے ہاتھ میں رہی۔ اس مکتبے سے کتبِ سلف کے بڑے ذخیرے کی اشاعت ہوئی۔

ہم نے یہاں عالمِ عرب کے چند معروف اداروں کا ذکر کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے عبد السلام ہارون کی کتاب ''القطوف الادبیہ'' دیکھی جا سکتی ہے۔

مطابع قازان :

جمہوریہ تاتارستان کا دار الحکومت قازان علومِ اسلامیہ کی نشر و اشاعت و ترویج میں ایک خاص

مقام رکھتا ہے۔ اسے عالمِ اسلام میں مصحّح مصحف شریف کی طباعت کا اعزاز حاصل ہے۔ قرآن مجید کی سب سے پہلی طباعت اٹلی کے شہر بندقیہ (وینس) میں ہوئی۔ پھر دوسری اشاعت ہیمبرگ میں ۱۶۹۴ء میں اور تیسری ہالینڈ کی مشرقی نو آبادی ولندیزی شرق الہند کے صدر مقام بٹاویا میں ۱۶۹۸ء میں ترجمہ و تعلیق کے ساتھ ہوئی۔ اس کے بعد روس کے صدر مقام سینٹ پیٹرس برگ میں مولای عثمان کی زیرِ نگرانی ۱۷۸۷ء میں ہوئی تھی۔ تاہم عالمِ اسلام میں پہلی بار یہ شرف قازان کو حاصل ہوا، جہاں ۱۸۴۸ء میں (یہ تاریخ استاذ یحییٰ جنید ساعاتی نے ذکر کی ہے، جب کہ صحیح ۱۸۰۳ء ہے) محمد شاکر مرتضیٰ اوغلی کی زیرِ نگرانی قرآن کریم چھاپا گیا اور یہ طبع سب پر فائق رہی، کیوں کہ اس میں تصحیح اور رسمِ عثمانی کا التزام کیا گیا تھا، جب کہ سابقہ طبعات کثرتِ اخطا کے علاوہ رسمِ عثمانی کے عدمِ التزام کی وجہ سے عالمِ اسلام میں مقبول نہ ہوسکی تھیں۔ سلطنتِ عثمانیہ میں کتبِ اسلامیہ چھاپا جانے کے باوجود مصحف شریف کی طباعت سے گریز کی وجہ بھی شاید یہی ہوسکتی ہے۔ پھر اس کے بعد تہران، لبنان، مصر اور ہند وغیرہ میں مصاحف کی طباعت شروع ہوئی، تو قازان میں کتبِ اسلامیہ کی طباعت پر توجہ دی جانے لگی، جس میں مطبع کریمیہ کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔

مطبعہ کریمیہ :

اس کی بنیاد کریموف الثلاث یعنی تین بھائی شریف جان محمد جان اور حسن جان نے یکم مارچ ۱۹۹۰ء کو رکھی۔ یہ قازان کا پہلا مقامی مطبع تھا۔ شریف اور حسن جان یہ روس میں عالمِ اسلام کی معروف شخصیت و عالم بے بدل شیخ الاسلام امام شہاب الدین مرجانی حنفی ماتریدی رحمہ اللہ (۱۸۰۸ء-۱۸۸۹ء) کے تلامذہ میں سے تھے۔ اسی مکتبے سے شیخ الاسلام کی کتابوں کی طباعت کا اہتمام ہوا، جو دقتِ نظر میں اپنی مثال نہیں رکھتیں۔ شیخ کی چند کتابیں ابھی حال ہی میں عالمِ عرب میں از سرِ نو طبع ہوئی ہیں۔ ان کی دیگر کتب بھی طبع ہو جائیں، تو نفع عام ہوگا۔ بہر حال یہ مکتبہ قلیل عرصے ہی میں امیر ترین مکتبہ شمار ہونے لگا۔ انیس سال کے قلیل عرصے میں اس مکتبہ سے ۱۷۰۰ کتب و رسائل شائع ہوئے اور تقریباً دو کروڑ نسخوں کی طباعت ہوئی، لیکن بد قسمتی سے ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان یہ کیمونسٹ حکومت کی کتابوں اور منشورات کی طباعت پر مجبور ہوا۔

پھر جلد ہی کیمونسٹ حکومت نے ۱۹۱۹ء میں اسے بند کر دیا اور اس کی املاک کو ضبط کرلیا اور یوں اُمت کو اس عظیم چشمۂ خیر سے محروم کر دیا گیا۔

مطابعِ ہندوستان :

ہندوستان میں طباعت کا آغاز ۱۵۵۶ء میں ہوا۔ نادر علی خاں کے مطابق سب سے پہلے گوا شہر میں طباعت ہوئی۔ اس دور کی اشاعت نصاب الاطفال مطبوعہ ۱۵۵۹ء کی ایک کاپی پیرس میں محفوظ ہے۔ ہندوستان کے قدیم ترین مطابع میں یہ نام ملتے ہیں: مطبع پنی کیل ضلع ٹناولی (قیام ۱۵۷۸ء)، مطبع وپی کوٹا (قیام ۱۶۰۲ء کے بعد)، امبلا کاڑ (قیام قبل از ۱۶۷۹ء) اور مطبع مدراس (قیام ۱۷۱۳ء)۔ بمبئی میں رستم جی کیشا پتی نے ۱۷۷۷ء میں مطبع قائم کیا۔ مطبع کلکتہ ۱۷۸۰ء میں شروع ہوا۔ غرض دوسو سال کے دوران ہندوستان کے بہت سے شہروں میں مطابع قائم ہوئے۔

برِصغیر کو اسلامی کتب کی طباعت میں سبقت کا شرف بھی حاصل ہے، مثلاً کتب صحاح ستہ کا اہم جز ''سنن نسائی'' دنیا میں سب سے پہلے ہندوستان میں طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ حدیث کے کئی اہم ذخائر ہندوستان میں پہلی مرتبہ طبع ہوئے۔ اسی طرح علامہ احمد علی سہارنپوری اور امام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہما اللہ کی تصحیح وحاشیہ کے ساتھ سب سے پہلے ''بخاری شریف'' ہندوستان میں ۱۲۷۰ھ بمطابق ۱۸۵۳ء میں طبع ہوئی۔

مخطوطات کی تحقیق وطباعت میں ہمارے اکابر کی سبقت تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اس پر محققین وفاضلین کو توجہ دینی چاہیے، تاکہ ان سے نسبت کی قدر ہو اور ان کی بلند پایاں خدمات سامنے آسکیں۔ ''سنن نسائی'' کی طباعت سے متعلق مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی لکھتے ہیں:

> ہمارے یہاں بفضلہٖ تعالیٰ جو کتابیں موجود ہیں، ان میں پوری دنیا میں متون حدیث میں سے سب سے پہلے شائع مکمل کتاب ''سنن نسائی'' (جو صحاح ستہ کا ایک اہم جز ہے) بھی موجود ہے۔ یہ کتاب حضرت شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ کی تصحیح، توجہ اور کوشش سے ہندوستان کے آخری مغل مسند نشیں بہادر شاہ ظفر کے ذاتی مطبع ''مطبع سلطانی'' سے جو قلعۂ معلیٰ میں تھا، ۱۲۵۶ھ موافق ۱۸۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے آخر میں

درج خاتمۃ الطبع کے الفاظ یہ ہیں: ''وكان الفراغ من هذه النسخة المباركة الميمونة، المسمى بالنسائي، سنة ست وخمسين بعد الالف والمائتين من الهجرة النبوية، على صاحبها الصلاة التحية في دار الخلافة شاه جهان آباد في عهد بهادر شاه''۔ [۱۲۵۶ھ مطابق ۴۱/۱۸۴۰ء] اس طباعت کے کل چھ سو ستر صفحات ہیں۔ آخر میں چودہ صفحات کا صحت نامۂ اغلاط بھی شامل ہے۔ آغازِ کتاب پر ایک صفحے میں حضرت شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ کی ''سنن نسائی'' کی حضرت امام نسائی رحمہ اللہ تک سند ہے، جس کا آغاز اس طرح ہوا ہے: ''يقول العبد الضعيف، خادم علماء الآفاق، محمد إسحاق: أخبرنا وأجازنا شيخنا ومولانا الشيخ الاجل المحدث الشاه عبد العزيز الدهلوي، لهذا الكتاب......''

اور پھر آگے فرماتے ہیں:

میری ناچیز معلومات میں دنیا بھر میں اُمہاتِ کتبِ حدیث میں سے جو کتاب اُفقِ طباعت پر سب سے پہلے جلوہ گر ہوئی، وہ یہی ''سنن نسائی'' ہے، اور جس کو حضرت شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ نے مرتّب کر کے مطبع سلطانی قلعہ معلّٰی شاہ جہاں آباد دہلی سے ۱۲۵۶ھ میں شائع کرادیا تھا۔ اس طباعت کا ایک عمدہ نسخہ ہمارے یہاں محفوظ ہے، جس میں حضرت مولانا نورالحسن [وفات: ۱۲۸۵ھ بہ مطابق ۱۸۶۸ء] نے حضرت شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ سے اور حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی رحمہ اللہ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ سے ۱۳۱۴ھ میں پڑھا۔ ان دونوں حضرات نے اپنے اساتذہ کے درس میں اس کی تصحیح کی بھی کوشش کی ہے۔ اس پر دونوں کے قلم سے تصحیحات اور مختصر مختصر افادات درج ہیں۔ اس طباعت کے دو نسخے اور بھی میری نظر سے گزرے ہیں، جن میں سے ایک حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ محمد اسحاق رحمہم اللہ کے شاگرد مولانا منشی جمال الدین کتانوی رحمہ اللہ [مدارالمہام ریاست بھوپال، جو بعد میں نواب صدیق حسن خاں کے خسر بھی ہو گئے تھے،] کا مملوکہ ہے۔

اس پر منشی جی کی مہر بھی ہے۔اس میں انہوں نے پڑھایا بھی ہے اور اس پر ان کے قلم سے تصحیحات بھی ہیں۔

۱۲۳۳ھ [۱۸/ ۱۸۱۷ء] میں دہلی میں کیا تقریباً پورے شمالی ہندوستان میں کوئی قابلِ ذکر مطبع یا طباعتی ادارہ نہیں تھا۔دہلی میں جہاں تک معلوم ہے سب سے پہلا مطبع مولوی محمد حیات کا تھا۔دوسرا مطبع سلطانی تھا، جو لال قلعہ میں قائم ہوا تھا۔پھر اور مطابع قائم ہوتے چلے گئے۔

(یہ اقتباس حضرت کے ایک مکتوب سے لیا گیا ہے، جو مولانا عبدالمتین منیری کے واسطے سے ہمیں پہنچا ہے۔سعد)

اس اقتباس سے شمالی ہندوستان میں طباعت کی تحریک کا پتا چلتا ہے اور یہ ہے کہ عالمِ اسلام میں برِصغیر نے کتبِ اسلامیہ کی اشاعت میں سبقت حاصل کر رکھی ہے۔اب ہم بطور نمونہ ذیل میں مطابع کا مختصراً تذکرہ کرتے ہیں، جس سے ہندوستان میں کتبِ اسلامیہ کی طباعت پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

مطابع لکھنؤ:

لکھنؤ میں مطابع کی اِبتدا مطبع سلطانی سے ہوئی۔اس کی بنیاد غازی الدین حیدر (متوفی ۱۸۱۴ء) نے رکھی اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں طباعت کا کام شروع ہوا۔ ۱۸۳۹ء میں لکھنؤ میں دو اور مکتبات بھی موجود تھے، ایک مطبع محمدی جس کے بانی حاجی حرمین شریفین تھے اور دوسرا مطبع مصطفائی اس کے بانی مصطفیٰ خان پسر روشن خان تھے۔ان دو مطابع نے آگے چل کر قابلِ ذکر کام کیا۔

مطبع نَوَل کشور یا مطبع اَوَدھ اخبار:

اس کی بنیاد منشی نول کشور نے ۲۳ نومبر ۱۸۵۸ء میں رکھی۔اس مطبع نے خوب ترقی کی، یہاں تک کہ ایشیا کا سب سے بڑا مطبع کہلایا جانے لگا۔اس نے قرآن مجید کے علاوہ علومِ اسلامیہ کی نشر و اشاعت کا خوب اہتمام کیا۔

مطابعِ دہلی :

مطبع مجتبائی بازار چاڈری عقب جامع مسجد مجاریہ منشی ممتاز علی میں واقع تھا۔ اس کے مالک عبدالاحد تھے۔ اس کی بنیاد ۱۸۶۳ء سے قبل رکھی گئی۔ دہلی کے مطابع اسلامیہ میں اس کی بے مثال خدمات ہیں۔ اس میں اشاعتِ قرآن مجید اور کتبِ اسلامیہ کا خاص اہتمام تھا۔ دہلی کے مطابع میں مطبع فاروقی، مطبع انصاری اور مطبع احمدی بھی قابلِ ذکر ہیں۔

اس حوالے سے مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: ہندوستانی پریس ۱۹۵۶ء تا ۱۹۰۰ء از نادر علی خان۔

مآخذ :

۱۔ جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، مصر، مؤسسۃ ہنداوی، ۲۰۱۳ء۔

۲۔ عبدالسلام ہارون، قطوف ادبیۃ، مصر، مکتبہ السنہ، نومبر ۱۹۸۸ء۔

۳۔ یحییٰ محمود جنید ساعاتی، تاریخ طباعۃ القرآن الکریم باللغۃ العربیۃ فی اوربا فی القرنین السادس عشر والسابع عشر المیلا دیین، بحوالہ: عالم الکتب (میگزین)، ستمبر/ اکتوبر ۱۹۹۴ء۔

۴۔ نادر علی خاں، ہندوستانی پریس ۱۹۵۶ء-۱۹۹۰ء، لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۹۰ء۔

مَعْهَدُ الشُّرُوقِ الإِسْلَامِي

A-204، حنید سٹی، گلستان جوہر بلاک 17، کراچی 1246233 311 92+

mahadalshorooqalislami@gmail.com